تعلیم و تربیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! توکل کے لفظی معنی بھروسا کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں توکل خدا پر بھروسا کرنے کو کہتے ہیں، یعنی ہر کام عزم و ہمت اور تدبیر و کوشش سے سرانجام دینا اور یقین رکھنا کہ اگر اس میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور کام یابی عطا فرمائے گا جب کہ لغوی اعتبار سے قناعت کا مطلب ہے کہ اپنی قسمت پر خوش رہنا اور زیادہ کی خواہش نہ کرنا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ یعنی جو بھی عمل صالح کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت مگر شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو تو ہم اسے حیات طیبہ عطا کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قناعت ایسا خزانہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوگا۔

دیو جانسن کلبی یونان کا ایک عجیب کردار تھا۔ کلبی یونانی فلسفیوں کے ایک گروہ کا نام ہے۔ اس طبقے کا آغاز سقراط کے شاگرد انتی طینی نے کیا۔ ان فلسفیوں کا عقیدہ تھا کہ دُنیا میں نیکی سب سے افضل ہے اور تمام زندگی اس نیکی کے حصول میں گزارنی چاہیے۔ یہ لوگ علوم وفنون، مال و دولت اور عیش و انبساط کے مخالف تھے۔ دیو جانسن کلبی کو تاریخ نسل انسانی کا بہت بڑا متوکل اور قناعت پسند دانشور کہتی ہے۔ وہ آنکھوں سے اندھا لیکن دل و دماغ سے روشن شخص تھا۔ اس کے پاس ایک کتا تھا۔ یہ کتا اس کا ساتھی بھی تھا اور راہبر و رہنما بھی۔ اس کتے کی نسبت سے بھی لوگ اسے ''کلبی'' کہتے تھے۔ دیو جانسن کلبی کی درویشی اور سادگی پورے یونان میں مشہور تھی۔ وہ عموماً شہر سے باہر رہتا تھا۔ اگر اسے کھانے کے لیے کچھ مل جاتا تو وہ کھا لیتا تھا، بصورت دیگر فاقے کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ وہ کسی حد تک توحید پرست بھی تھا۔ اس کا کہنا تھا دُنیا کا سامان و اسباب انسان کو اصل خوشی سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر انسان زندگی میں حقیقی خوشی پانا چاہتا ہے تو اسے دُنیا کے ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے۔ دیو جانسن کلبی زندگی کے آخری حصے میں شہر سے نکل کر جنگل میں آباد ہو گیا تھا۔ بڑا مشہور واقعہ ہے سکندر اعظم اس کی تلاش میں شہر سے باہر نکلا۔ دیو جانسن کلبی ایک بیابان میں بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا۔ سکندر حاضر ہوا اور نہایت عاجزی انکساری سے عرض کیا: ''یا اُستاد میرا نام سکندر ہے اور میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' دیو جانسن نے مسکرا کر جواب دیا: ''خواہشوں کا غلام بادشاہ ایک آزاد شخص کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔'' سکندر نے اصرار جاری رکھا، جب تنگ آ گیا تو اس نے قہقہہ لگایا اور سکندر سے کہا: ''بادشاہ سلامت! آپ میری دھوپ روک کر کھڑے ہیں۔ مہربانی فرما کر میرے آگے سے ہٹ جائیں، مجھے سورج کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہونے دیں۔'' دیو جانسن کلبی آخری عمر میں توکل اور قناعت کے انتہائی عروج پر تھا۔ دیو جانسن کلبی سارا دن جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور شام کو واپس اپنے ٹھکانے پر آ جاتا تھا۔ یہ ٹھکانہ کچی مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹب تھا۔ وہ ٹب میں لیٹتا، ٹانگیں باہر نکالتا اور سوچتا سوچتا سو جاتا۔ یہ ٹب اس کی کل کائنات تھا۔ ایک دن سردیوں کی سنہری دوپہر تھی۔ دیو جانسن کلبی ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔ ایتھنز کا ایک ہرکارہ اس کے پاس آیا اور اسے آ کر خوش خبری سنائی۔ ''مبارک ہو! سکندر اعظم پوری دُنیا فتح کر کے واپس ایتھنز آ رہا ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور وہ تاریخی فقرہ کہا جو آنے والے زمانوں میں دیو جانسن کی پہچان بن گیا، جس نے پانچ ہزار سال بعد بھی دیو جانسن کلبی کو زندہ رکھا۔ اس نے کہا کہ ''اگر انسان قناعت پسند ہو تو وہ مٹی کے اس ٹب میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کے لیے چھوٹی ہے۔''

پیارے بچو! یقیناً توکل اور قناعت سے ہم اپنی دُنیا و آخرت سنوار سکتے ہیں۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں یاد رکھیے گا۔ اب اجازت!

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

سارے جہاں کے مالک ، سارے جہاں کے والی
تیری ہے ذات افضل ، تیری ہے شان عالی

تو نے اگائے سارے ، پھل پھول اور پودے
دُنیا کے باغ کا ہے ، تو ابتدا سے مالی

تو دو جہاں کا آقا ، تو دو جہاں کا مولا
کوئی بھی تیرے در سے آتا نہیں ہے خالی

تو نے بنایا عالم ، تو نے بسایا عالم
کرتی ہے ذکر تیرا ، گلشن کی ڈالی ڈالی

یا رب ! ہماری تجھ سے اتنی ہی آرزو ہے
جائیں نہ تیرے در سے خالی تیرے سوالی

آپ ﷺ نے فرمایا

ہر اک مقام سے ہے اونچا مقام اُنؐ کا
صادق ہیں وہ امیں ہیں احمدؐ ہے نام اُنؐ کا
رحمت ہیں وہ سراپا ہے فیض عام اُنؐ کا
عالی ہے مرتبے میں ادنیٰ غلام اُنؐ کا
اِسلام بن کے پہنچا گھر گھر پیام اُنؐ کا
کہلائیں وہ حدیثیں جو ہے کلام اُنؐ کا
کلمہ پڑھے مسلماں ہر صبح و شام اُنؐ کا
سب مشکلوں کا حل ہے دینی نظام اُنؐ کا
دائم رہے گا قائم بے مثل کام اُنؐ کا

رمضان المبارک کی آمد پر نبی پاکؐ نے ایک خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمایا۔ اس طویل خطبہ کے آخر میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''رمضان المبارک میں چار چیزوں کی کثرت کیا کرو۔ دو باتیں تو ایسی ہیں کہ تم ان کے ذریعہ اپنے رب کو راضی کرو گے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ تم ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ پہلی دو باتیں جن کے ذریعے تم اللہ تعالیٰ کو راضی کرو گے وہ یہ ہیں: کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت۔ اور وہ دو چیزیں جن سے تم بے نیاز نہیں ہو سکتے (یعنی تم ان کے محتاج ہو) وہ یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو اور جہنم سے پناہ مانگو۔''

(صحیح ابن خزیمہ، کتاب الصیام: 1887)

رمضان المبارک میں نبی پاکؐ نے چار چیزوں کی کثرت کا حکم فرمایا:

(1) کلمہ طیبہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ): کلمہ طیبہ تمام اذکار میں سب سے افضل ذکر ہے اور احادیث مبارکہ میں اس کے بہت سے فضائل مذکور ہیں۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ رب العزت سے عرض کیا: ''اے میرے پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جس کے ذریعہ میں آپ کو یاد کیا کروں اور آپ کو پکاروں۔''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھا کرو!''۔ یہ سن کر حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: ''اے میرے پروردگار! اس کو تو تیرے سب ہی بندے پڑھتے ہیں اور میں تو ایسی چیز چاہتا ہوں جو خاص آپ مجھ کو بتائیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! ساتوں آسمان اور جو میرے علاوہ ان کے آباد کرنے والے ہیں اور ساتوں زمینیں اگر ایک پلڑہ میں رکھ دی جائیں اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دوسرے پلڑہ میں رکھ دیا جائے تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ان سب کے مقابلے میں جھک جائے گا۔'' (شرح السنۃ للبغوی، کتاب الدعوات 1273)

پس رمضان المبارک کے اوقات میں کثرت سے ذکر کرنا چاہیے، خصوصاً کثرت سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھے۔

حدیث قدسی ہے نبی پاکؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کریں۔'' (بخاری، کتاب التوحید)

(2) استغفار: استغفار گناہوں کی مغفرت طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی کثرت سے استغفار کرے گا تو قیامت کے دن اپنے نامہ اعمال میں بھی اس کا اثر پائے گا اور اس کی وجہ سے وہاں گناہوں کی معافی اور نیکیوں کے انبار دیکھے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی پاکؐ نے ارشاد فرمایا: ''اس شخص کے لیے بہت عمدہ حالت ہے جو اپنے اعمال نامہ میں خوب زیادہ استغفار پائے۔'' (ابن ماجہ، کتاب الادب: 3818)

ایک حدیث میں جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص استغفار میں لگا رہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر دشواری سے نکلنے کا راستہ بنا دیں گے، اور ہر فکر کو ہٹا کر کشادگی عطا فرما دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔''

(ابو داؤد، باب فی الاستغفار: 1518)

معلوم ہوا کہ استغفار کرنے سے مشکلات میں آسانی اور رزق میں فراوانی ہوتی ہے۔ بہرحال کلمہ طیبہ اور استغفار یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے دیگر فائدوں سمیت اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہوتی ہے جو کہ تمام فائدوں میں سب سے بڑا فائدہ ہے۔

(3) جنت کا سوال (4) جہنم سے خلاصی

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے جہنم کی طرح کوئی چیز نہیں دیکھی کہ جس سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور جنت کی طرح کی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس کا طالب سو گیا ہو۔''

(ترمذی، ابواب صفۃ جہنم: 2601)

جنت اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی جگہ ہے اور راحت کا مکان ہے جب کہ جہنم اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی جگہ اور عذاب کا مقام ہے۔ ایک مؤمن کو ہمیشہ جنت کا طالب رہنا چاہیے اور جہنم سے پناہ طلب کرنی چاہیے۔ ☆☆☆

ایمان کی قوت

ریاض احمد

عرب کے صحرا کے قریب قدیم زمانے سے غیر مسلموں کی ایک بستی آباد تھی۔ گو کہ اس بستی میں ہر مذہب کے لوگ آباد تھے مگر زیادہ تعداد بت پرستوں کی تھی۔ اس بستی میں بھگوان داس کا گھرانہ اس لیے مشہور تھا کہ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بتوں کی دھوم دُور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اتنی مہارت تھی کہ اس کے بنائے ہوئے بت ہاتھوں ہاتھ بک جاتے۔

بھگوان داس کی 13 برس کی ایک بیٹی تھی جس کا نام سوترا تھا۔ اسے بت پرستی سے سخت نفرت تھی۔ ان کی بستی میں ایک مسلمان بزرگ رہتے تھے جو لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کو لوگ بابا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ سوترا گھر کے کاموں سے وقت نکال کر چوری چھپے بابا جی کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے جاتی تھی مگر اس راز کو کوئی نہ جانتا تھا۔ آہستہ آہستہ سوترا دینِ اسلام کی طرف راغب ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن سوترا نے اپنے ابا بھگوان داس سے سوال کیا کہ ابا کل تک تو آپ اپنے ہاتھوں سے اس بت کو بنا رہے تھے، آج آپ نے اس کی پوجا شروع کر دی ہے؟ بھگوان داس بیٹی کی بات سن کر چونک گیا۔ کچھ سنبھلا تو اس نے بڑے پیار سے بیٹی کو سمجھایا کہ یہ ہمارے خدا ہیں، ہمارے حاجت روا ہیں۔ ہمارے دل کی پکار سنتے ہیں، ہمیں لڑائیوں میں فتح دلواتے ہیں۔ جب خشک سالی ہوتی ہے تو آسمانوں سے بارش برساتے ہیں۔ سوترا ابا کی بات سن کر حیران ہوئی اور سوچنے لگی کہ یا تو بابا جی صحیح ہیں یا پھر میرے ابا! پھر سوترا نے بھگوان داس سے سوال کیا کہ کیا ان مٹی کے بتوں سے میں کوئی فرمائش کروں تو وہ پوری کریں گے؟ بھگوان داس نے مسکراتے ہوئے بیٹی سے کہا کہ اگر سچے دل سے بھگوان سے کسی چیز کی فرمائش کرو گی تو وہ ضرور پوری کریں گے۔ سوترا نے بھگوان داس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی حقیقت کو جاننے کے لیے اپنے ابا کی طرح بھگوان کی مورتی کے آگے اپنا سر جھکا کر گڑیا کی فرمائش کر ڈالی۔

کئی روز گزر جانے کے بعد بھی سوترا کو گڑیا نہیں ملی تھی۔ ایک دن سوترا مایوس ہو کر اپنے ابا کو کہنے لگی کہ ابا آپ کے بھگوان تو میری سنتے ہی نہیں۔ ایک گڑیا تک تو مجھے دے نہیں سکتے تو پھر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ آسمان سے پانی برساتے ہوں گے؟ بھگوان داس بیٹی کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ اس سے پہلے کہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے، مجھے اس کے بارے میں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ یہ اس طرح راستے پر نہیں آئے گی۔ پھر وہ بڑی عقل مندی سے بیٹی کا دھیان دوسری طرف لے جانے میں کام یاب ہو گیا اور

کہنے لگا کہ میری پیاری بیٹی صرف اس بات سے پریشان ہو رہی ہے؟ بھگوان نے تو تمہاری فرمائش اسی دن پوری کر دی تھی۔ جاؤ جا کر میرے کمرے سے اپنی گڑیا اُٹھا لاؤ اور ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ بھگوان کے بارے میں پھر اُلٹے سیدھے خیال اپنے دل میں نہ لانا۔ اس کے بعد سوترا خوشی سے دوڑتی ہوئی گڑیا اُٹھانے کے لیے آگے بڑھی تو اچانک دو بلیاں آپس میں جھگڑتی ہوئی کمرے میں آ گئیں اور لڑتے ہوئے بھگوان کی مورتی کے ارد گرد گھومنے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بلیاں بھگوان کی مورتی سے ٹکرائیں جس سے وہ مورتی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر سوترا حیران رہ گئی۔ پھر سوچنے لگی کہ جو خدا خود کو جانوروں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، وہ بھلا پوری کائنات کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے۔ پھر سوترا ٹوٹی ہوئی مورتی کے ٹکڑوں کو سمیٹنے لگی تو بھگوان داس اسے دیکھ کر رُک گیا اور اُبھرتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ سوترا میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا کچھ بھی کر سکتی ہو۔ وہ سمجھا کہ شاید سوترا نے جان بوجھ کر بھگوان کی مورتی کو گرایا ہے۔ سوترا، بھگوان داس کا سرخ چہرہ دیکھتے ہی رونے لگی۔ اس نے جواب دیا: ''ابا یہ میں نے نہیں کیا۔'' پھر معصومیت سے کہنے لگی: ''بلیاں اس سے ٹکرائیں تھیں جس کی وجہ سے یہ گر کر ٹوٹی ہے، چاہے تو آپ اس ٹوٹی ہوئی بھگوان کی مورتی سے پوچھ سکتے ہیں۔ آپ کا بھگوان تو جھوٹ نہیں بولے گا۔'' بھگوان داس لاجواب ہو چکا تھا۔ پھر سوترا نے کہا: ''ابا! میں یہ بھی جان چکی ہوں کہ یہ گڑیا بھگوان کی دین نہیں ہے بلکہ یہ آپ خود بازار سے خرید کر لائے ہیں۔ ابا! یہ مٹی کے بت کبھی خدا ہو ہی نہیں سکتے جنہیں آپ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، پھر ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بزرگ بابا جی سے سب جان چکی ہوں۔ حقیقت میں خدا ایک ہی ہے جو بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اسی نے ہی پوری کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی ہر جاندار کو رزق دیتا ہے۔ وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، وہ ہی بیماروں کو شفا دیتا ہے، بے اولادوں کو اولاد دیتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ہی عبادت کے لائق ہے۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ بزرگ بابا جی نے مجھے اس سچے اور ستھرے مذہب اسلام کا کلمہ پڑھا دیا ہے اور میں اس حقیقی خدا پر ایمان لے آئی ہوں۔ اب دُنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کی آواز بلند کرنے سے نہیں روک سکتی۔ میرے دل میں عشقِ محمد ﷺ کا چراغ جل چکا ہے۔ اے محمد ﷺ کے رب تو گواہ رہنا میں بت پرستی کے مذہب کو چھوڑ کر تیرے اور تیرے آخری رسول ﷺ پر ایمان لے آئی ہوں۔ میں رسولِ عربی ﷺ کا کلمہ آخری سانس تک پڑھتی رہوں گی۔'' بھگوان داس بیٹی کی باتیں سننے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو سوترا نے پیچھے سے آواز لگائی: ''ابا! بھگوان کی ٹوٹی ہوئی مورتی کے ٹکڑے اپنے ساتھ لے جائیں شاید یہ تنہائی میں آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔''

بھگوان داس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ اس کے پاس سوترا کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا کیوں کہ اب وہ جان چکا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی ایسی طاقت بول رہی ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ بھگوان داس نے بیٹی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوترا شباب کی منزل پر قدم رکھ چکی تھی۔ اب اس نے اپنا نام سوترا سے تبدیل کر کے سمعیہ رکھ لیا تھا۔ گھر والوں کے سو جانے کے بعد وہ اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیتی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر میں مشغول ہو جاتی۔ اس کا رشتہ دُنیاوی خواہشات سے ٹوٹ چکا تھا۔ وہ سب سے الگ رہتی اور یادِ الٰہی میں مشغول رہتی۔ سوترا کی دیوانوں جیسی حالت دیکھ کر اس کے ماں باپ پریشان رہتے۔ ہزاروں منت کے باوجود بھی وہ عالمِ ہوش کی طرف لوٹنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا دل رسولِ عربی ﷺ کی عقیدت سے سرشار ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ بھگوان داس نے بستی میں بدنامی کے ڈر سے یہ مشہور کیا ہوا تھا کہ میری بیٹی پر آسیب کا اثر ہے جس وجہ سے اس کو پاگل پن کے دورے بھی پڑتے ہیں۔ بھگوان داس نے شہر کے پنڈتوں، جادوگروں کو حقیقت بتائی اور ان سے کہا کہ اگر بستی والوں کو پتا چل گیا کہ میری بیٹی مسلمان ہو گئی ہے تو لوگ مجھ سے بت نہیں خریدیں گے اور وہ سوترا کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔ ایسے تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔ پنڈتوں اور جادوگروں نے بھگوان داس کو بتایا کہ تمہاری بیٹی کی زندگی کی بھاگ دوڑ کسی بالائی طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ بستی کے لوگوں کو پتا چلنے سے پہلے تم نے اپنی بیٹی کو ختم نہ کیا تو یہ

بھی ہوسکتا ہے کہ اس اکیلی شکتی کے آگے ہم کمزور پڑ جائیں گے۔ جلدی سے اسے مار دو، ورنہ ان مٹی کے خداؤں کو ہوا میں خاک بن کر اُڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم سب کے چولہے ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ ہمارا فیصلہ یہ ہی ہے کہ سوترا کو آج رات موت کی نیند سلا دیا جائے۔

آج سمعیہ کی زندگی کی آخری شام ہوگی، اس بات کی اطلاع اسے مل چکی تھی مگر وہ بے خوف ہو کر ذکرِ خداوندی میں مشغول رہی۔ رات کو بھگوان داس جب سمعیہ کے کمرے کے نزدیک پہنچا تو کمرے میں بے پناہ روشنی دیکھ کر محسوس کرنے لگا کہ شاید اسے منصوبے کا علم ہو گیا ہے، اسی لیے اس نے اپنی حفاظت کے لیے فانوس جلا کر کمرہ روشن کر دیا ہے۔ وہ کمرے کے باہر فانوس بند ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی روشنی کم نہ ہوئی تو بھگوان داس نے جوش میں آ کر زور سے دروازے کو ٹھوکر لگائی اور اندر داخل ہو گیا۔ جب وہ کمرے کے اندر پہنچا تو حیران ہو گیا کہ کمرے میں کوئی فانوس روشن نہیں ہے مگر کمرہ ایسے روشن ہے جیسے دن نکل آیا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر بھگوان داس کی نظریں دھندلا گئیں اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ جب اس نے زمین سے خنجر اُٹھایا تو اتنے میں سمعیہ بھی جاگ گئی۔ اس نے ابا کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر کہا: ”اگر میری زندگی کا آخری وقت آ ہی گیا ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔“ پھر بھگوان داس نے سمعیہ کی طرف خنجر بڑھایا تو اس نے کہا: ”ابا! ذرا اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ آپ کو اپنی بیٹی کا ناحق خون کر کے کیا ملے گا۔ ابا جی، میں تو کہتی ہوں آپ بھی کلمہ پڑھ کر توحید و رسالت ﷺ کا اقرار کر لیں۔ پھر آپ پر بھی نور کی برسات ہونے لگے گی کیوں کہ توبہ زندگی میں کی جاتی ہے موت کے بعد نہیں۔ بھگوان داس نے کہا کہ آج مجھ پر تمہاری کسی بات کا اثر نہیں ہونے والا۔ جب سے تم مسلمان ہوئی ہو، تب سے میرا چین چھن گیا ہے۔ اگر لوگوں کو پتا چل گیا تو وہ میرے کاروبار کا کیا ہوگا؟ میں تو برباد ہو کر رہ جاؤں گا۔ اسی لیے تمہیں مارنا ہی بہتر ہے۔ سمعیہ نے کہا: ”ابا جی، رزق دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، کوئی کسی کا رزق نہیں چھین سکتا۔ بھگوان داس نے کہا: ”میں تمہیں مارنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ سمعیہ نے کہا: ”اگر آپ اپنے ارادے پر قائم ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کیا آپ مرنے والے کی آخری خواہش نہیں پوچھیں گے؟“ بھگوان داس نے کہا: ”جلدی بتاؤ۔“ سمعیہ نے کہا: ”آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں جو کام آپ کا دل کرنے پر مجبور کرے، وہ کام نہیں کریں گے۔ یہ ہی میری آخری خواہش ہے۔“

یہ بات سنتے ہی بھگوان داس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سمعیہ کو ابا کے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر بھگوان داس نے بیٹی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے وعدے پر عمل کرتے ہوئے بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ

ترک کر دیا اور باہر چلا گیا۔

گھر کے باہر پنڈت، جادوگر اور ان کے حواری اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب بھگوان داس آ کر ہمیں خوشی کی خبر دے گا کہ اس نے بیٹی کو قتل کر دیا ہے۔ جب بھگوان داس گھر سے باہر آیا تو انہوں نے اس سے سوال کرنا شروع کر دیئے لیکن آج بھگوان داس نے اس جھوٹے دین کا سر کچل دیا تھا اور سب کے درمیان فخر سے سر بلند کر کے اس نے کہا کہ جو شخص سوترا کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے پہلے وہ مجھ سے وعدہ کرے کہ جو کام اس کا دل کرنے پر مجبور کرے، وہ کام نہیں کرے گا۔ سب نے کہا: ''ہم وعدہ کرتے ہیں مگر سوترا کو قتل کیسے کریں گے؟ اس کو قتل کیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، ہم تو اسے مار کے ہی دم لیں گے۔'' آخر وہ لوگ باز نہ آئے اور سوترا کو قتل کرنے کی غرض سے بھگوان داس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سمعیہ پر ہتھیاروں سمیت ٹوٹ پڑے مگر جیسے ہی انہوں نے اپنے ہاتھ اسے مارنے کے لیے بلند کیے تو انہیں فوراً بھگوان داس سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا، اسی وقت ان کے اُٹھے ہوئے ہاتھ جھک گئے۔ لہٰذا انہوں نے سمعیہ کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کمرے میں خوشبو اور روشنی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ آج وہ جان گئے تھے کہ سوترا جس خدا کی عبادت کرتی ہے، وہی سچا ہے۔ اسی وجہ سے خدا کی طرف سے اس پر اتنے انعامات ہیں۔

ادھر بھگوان داس غم سے نڈھال بیٹھا تھا کہ پتا نہیں اندر کیا ماجرا چل رہا ہے۔ کچھ سنبھلا تو اس نے دل میں ارادہ کیا کہ لوگوں نے سوترا کو مار دیا ہوگا، اب چل کر بیٹی کی لاش ہی اُٹھا لاؤں۔ جب وہ کمرے میں پہنچا تو بیٹی کو زندہ سلامت دیکھ کر حیران رہ گیا، اس کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بھگوان داس نے کہا کہ آپ لوگ تو میری بیٹی کو قتل کرنے کے لیے اندر آئے تھے لیکن میری بیٹی زندہ سلامت کیسے بچ گئی۔ سب لوگوں نے جملہ آواز میں کہا: ''آپ نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ جو کام آپ کا دل کرنے کو مجبور کرے، وہ کام نہیں کریں گے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ ایک اور بات کہ ہمارا دل عمر بھر ہمیں بت پرستی پر قائم رہنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن آج ہم نے دل کی بات نہ مان کر ہمیشہ کے لیے بت پرستی کو چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھگوان داس اور اس کے ساتھیوں نے سمعیہ سے کہا کہ ہمارے خون میں ایمان اور یقین کی توانائی جاگ اُٹھی ہے۔ ہمیں اسلام کے اس پاک دین میں داخل ہونے کا شرف دو جس نے انسان کو ایک مکمل ضابطہ حیات دیا اور دُنیا میں توحید کو پھیلایا۔ سمعیہ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ کرنے کے بعد کہا: ''ہمیں ایسی طاقت کے آگے اپنا سر جھکانا چاہیے جو حقیقی خالق، رازق، مدد کرنے والا اور موت و حیات کا مالک ہو۔ دین اسلام ہی سچا ہے اور یہی غالب رہے گا۔ ہم سب اسی دین کو قبول کرتے ہیں اور توحید و رسالت، ملائکہ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس طرح وہ تمام لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور دینِ اسلام کے مطابق اپنے نام بھی تبدیل کر لیے۔ اس طرح پوری بستی اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئی اور سب لوگ عشق رسول ﷺ میں اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔

☆☆☆

''کھوج لگایئے'' میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

اذکیٰ آصف، پشاور۔ رانا محمد فہیم سعید، فیصل آباد۔ عبدالرحمٰن بٹ، سیال کوٹ۔ مریم عزیز، لاہور۔ نمرہ فاروق، لاہور۔ محمد آیان شیراز، اوکاڑہ۔ جویریہ ادریس، ماریہ ادریس، سیال کوٹ۔ زینب شاہ، مانسہرہ۔ منزہ فاطمہ، ملتان۔ اسامہ ظفر راجہ، راول پنڈی۔ لاریب ممتاز، لاہور۔ اقراء گل سید، چارسدہ۔ ماہم ظفر، لاہور۔ طلحہ خباب علی، تلہ گنگ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ عاطف ممتاز، تلہ گنگ۔ سعد حسن، اسلام آباد۔ محمد عبداللہ، کوٹ مومن۔ جائشہ وردہ، لاہور۔ مائرہ تسیم، رحیم یار خان۔ رانیم سلطان، جہلم۔ نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ۔ نجم السحر، ملک وال۔ محمد حسن سعید، لاہور۔ عزیز احمد، لاہور۔ محمد انعام الحق، اسلام آباد۔ اشعر علی خان، ڈیرہ غازی خان۔ معظم علی، اوکاڑہ۔ آیت شاہد، لاہور۔ منیب الرحمٰن انجم، فیصل آباد۔ مریم فاطمہ، بھکر۔ فاطمہ احمد، گوجرانوالہ۔ خاور اقبال، میانوالی۔ جویریہ فرید، لاہور کینٹ۔ عریفہ الستار، میانوالی۔ آئمہ عامر، فیصل آباد۔ نمرہ افضل، فضہ افضل، جھنگ صدر۔ سارہ ارشد، سرگودھا۔ حمزہ جاوید، کھاریاں۔ عزہ عائشہ، شیخوپورہ۔ سفیان الدین، نوشہرہ۔ محمد عبداللہ وسیم، لاہور۔ فاعمہ تحریم، کراچی۔ محمد مغیث طارق، واہ کینٹ۔ حسین اکمل قریشی، لاہور۔ عبدالباری، مانسہرہ۔ تمیر احمد، گجرات۔ اسد عبداللہ، ملتان۔ محمد دانیال، سرائے عالم گیر۔ عروج فاطمہ، لاہور۔ عرین احمد، ساہی وال۔ ماریہ افضل، حویلیاں۔ ثمن رؤف، لاہور۔ سمیر خان، لاہور۔ انجیٰ عارف، لاہور۔ خولہ زیب خان، پشاور۔ سیف اللہ خلیق راجہ، واہ کینٹ۔ طلحہ اسفندیار، ملتان۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ خنساء مریم، لاہور۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ صفی الرحمٰن، مطیع الرحمٰن، لاہور۔ اصفیٰ بتول کمبوہ، فیصل آباد۔ محمد مجاہد الیاس، فیصل آباد۔ بنت الطاف الرحمٰن، بہاول نگر۔ زینب جاوید، ماہ نور جاوید، محمد منیر عبداللہ، لاہور کینٹ۔ محمد طیب اکرم، گوجرانوالہ۔ رشدہ عدنان، کراچی۔ سعید احمد ضیغم، پشاور۔ عائشہ خالد، راول پنڈی۔ حسنہ موسیٰ، شرقپور شریف۔ محمد یاسین ظہور، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عبید الرحمٰن، اسلام آباد۔

بے چاری کرن

محمد فاروق دانش

"میں روزے رکھوں گی! اگر میری سحری کا بندوبست......" وہ ابھی آگے کچھ کہتی لیکن اس کے معصوم سے چہرے پر زور کا طمانچہ پڑا تھا۔ وہ سہم کر رہ گئی۔ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اس تھپڑ کا بدلہ بھی اسی انداز سے لے لیکن وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس پر ایسا بھی وقت آئے گا۔

یہ کرن تھی معصوم سی۔ ان کا گھرانہ بے حد خوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کرن نے دکھ کا کوئی لمحہ نہ دیکھا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اگر تھپڑ لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ کرن بارہ برس کی خوب صورت لڑکی تھی، اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا ندیم۔ ان کے ماں باپ بھی بہت شفیق تھے، ان کا بے حد خیال رکھنے والے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنے والے۔

کرن چھٹی جماعت میں تھی جب کہ ندیم تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ ان کے گھر میں ان کے چچا سلیم اور ان کی فیملی رہتی تھی۔ سلیم کے حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ کرن کے والد کلیم اپنے بھائی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے تھے جیسا ایک باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔ گھر میں کوئی چیز لاتے تو ان کے ہاتھ میں دو بیگ ہوتے۔ پہلے سلیم کے گھر میں ایک بیگ جاتا تو دوسرا وہ اپنے گھر لے کر جاتے۔

ایک شام ندیم کو بخار چڑھا، دونوں میاں بیوی پریشان ہوگئے۔ ایک دو روز محلے کے ڈاکٹر سے دوا لے کر دیکھی لیکن اس کا بخار ٹھیک نہ ہو سکا تو ڈاکٹر نے انہیں شہر میں بچوں کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنے کو کہا۔ کرن کے امتحانات ہونے والے تھے، اس لیے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے سلیم بھائی کو بتایا کہ ہم شہر جا رہے ہیں، آپ کرن کا خیال رکھیں۔

انہیں بھلا کیا انکار ہوتا، انہوں نے کرن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے سمجھا کر اپنی گاڑی میں رخصت ہو گئے۔ اگلے دو دن وہ شہر میں ہی رہے۔ بچوں کے ماہر نے اپنی کلینک میں دو روز کے لیے ندیم کو داخل کر لیا تھا تاکہ مکمل علاج کے بعد اسے بہتر حالت میں روانہ کرے۔ کلیم صاحب نے گھر پر کرن اور اپنے بھائی سے رابطہ رکھا تھا اور ندیم کی حالت بتا رہے تھے۔ دو روز بعد جب ڈاکٹر کو اطمینان ہو گیا کہ ندیم اب بہتر ہو رہا ہے تو اس نے انہیں ادویات لکھ کر دے دیں اور گھر جانے کی اجازت دے دی۔ کلیم صاحب خوشی خوشی اسپتال سے باہر آئے۔ انہوں نے بازار سے دوائیں خریدیں، بچوں کے لیے تحائف لیے، اپنے بھائی کے لیے ایک جوڑا کپڑے کا خریدا اور گھر کی طرف چل دیئے۔

کرن بے چینی سے اپنے ابو کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے معلوم

تھا کہ وہ اس کے لیے بہت کچھ لائیں گے۔ اس کے ابو اس سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ خود بھی بہت پیاری۔ وہ سوچتی رہی، ٹہلتی رہی، کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر، کبھی کھڑکی میں تو کبھی دروازے میں۔ انہوں نے نہ آنا تھا اور وہ رات تک نہ آئے۔ وہ عجیب سے خوف میں مبتلا ہو کر رہ گئی تھی۔ سلیم بھائی نے اسے تسلی دی لیکن اسے اطمینان نہ ہوا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے ان کو چونکا دیا۔ سلیم صاحب نے آگے بڑھ کر فون اُٹھایا اور بات کرنے لگے۔ جوں جوں وہ بات کرتے گئے، ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔ کرن کی سوالیہ نگاہوں نے ان کے اس سحر کو ایک دم توڑ دیا۔ چند لمحوں بعد وہ گویا ہوئے۔

''بیٹا! ہمیں اسپتال چلنا ہوگا۔'' وہ پریشان تھے۔

''مگر کیوں..... کیا بات ہے؟'' اس نے مایوس لہجے میں سوال کیا۔

''تم بس اب سوال جواب نہ کرو اور میرے ساتھ چلو۔''

نہ جانے سلیم چچا نے ایسا کیوں کیا کہ اسے بھی اسپتال لے گئے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی کم نصیب ہے کہ اسے اپنے ماں باپ اور بھائی کی صورتیں شدید زخمی حالت میں دیکھنا پڑیں گی۔ گھر واپس آتے ہوئے ایک ٹرالر نے ان کی گاڑی کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے سر توڑ کوشش کی لیکن ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ بچ پاتے۔ کرن کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اب وہ کس کے سہارے زندگی گزارے گی؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔ اس کے چچا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے اپنائیت کا بھر پور احساس دلایا۔

رمضان المبارک شروع ہو چکے تھے۔ کرن کی امی اور ابو دونوں ہی روزے پابندی سے رکھتے تھے۔ کرن بھی روزے رکھ رہی تھی، اپنے ماں باپ اور بھائی کے بغیر کرن کی یہ پہلی عید تھی۔ اس کی آنکھوں میں اُداسی کے دیے جل رہے تھے، اسے اپنے خاندان کی غیر موجودگی میں عید منانے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو کس کے آسرے پر۔ اپنے چچا کی تو وہ کیا بتائے، انہوں نے چند دنوں تک تو اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ ان کے ماں باپ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ دوست، احباب، رشتے دار آتے تو، چچا کے ہمدردانہ رویے کو دیکھ کر ان کی تعریف کیے بنا نہیں رہتے تھے۔

ایک ماہ گزرنے کے بعد چچا اور چچی دونوں نے اس کے ساتھ ملازموں جیسا رویہ اپنا لیا۔ وہ پریشان سی ہوگئی۔ وہ عمر میں بھی چھوٹی تھی، فریاد کرتی بھی تو کس سے اور کیسے؟ دو ایک بار کوئی رشتے دار آیا اور کرن نے کچھ بتانے کا سوچا بھی لیکن اپنی چچی کی غصیلی نگاہوں کی تاب نہ لا کر وہ اپنے کرب کو اپنے اندر ہی سمو کر رہ گئی۔

اس کی دوست اور کلاس فیلوز عید کی تیاریوں میں مصروف تھیں، نت نئے کپڑے، رنگ برنگی چوڑیاں، خوب صورت چشمے، نفیس جوتے اور جانے کیا الا بلا خرید کر اپنی خوشیوں کو دوبالا کر رہی تھیں اور ایک وہ کم نصیب تھی کہ اس کے پاس خریدنے کے لیے کچھ نہیں جب کہ چچا سلیم نے اپنے بچوں کی تیاری خاموشی سے کرلی تھی اور اس کے نام پر دونوں میاں بیوی لڑ جھگڑ کر دکھا دیتے تھے جیسے میری تنخواہ میں سے کچھ نہیں بچ رہا تو میں عید کی تیاریاں کیا خاک کروں؟

کرن ان سب باتوں کو اپنے ننھے ذہن کے باوجود سمجھ تو رہی تھی لیکن کیا کرتی بے چاری۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی: ''اے میرے مالک! بچپن میں کسی کے ماں باپ نہ مریں، ان یتیموں کے سر پر تو کوئی ہاتھ پھیرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ وہ بے یار و مددگار ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے میرے پروردگار! چھوٹے بچوں کے ماں باپ کیوں مر جاتے ہیں۔''

وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے وقت گزار رہی تھی۔ اسے آنے والی عید، اپنے لیے کوئی خوشیاں لاتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پندرہ روزے اس نے ایسے گزارے کہ کبھی سحری درست نہیں تو کبھی افطاری بے مزا۔ ایسے میں ایک روز وہ اُداس سی بیٹھی تھی کہ ان کے گھر میں ایک صاحب تشریف لائے۔ سلیم صاحب انہیں اندر ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کرن بیٹی کے ساتھ اس گھر میں کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔'' یہ بات سلیم صاحب کے اندر کرنٹ سا دوڑا گئی۔ کرن کو ایسا لگا جیسے اللہ نے اس کی سن لی اور اب ضرور ظلم کی سیاہ رات کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

''نن.....نہیں تو.....ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ان کی آواز میں لکنت سی آگئی تھی۔

''بات یہ ہے کہ کلیم میرے بہت اچھے دوست تھے۔ ہماری دوستی بچپن کی تھی، اکثر ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ہمارے درمیان کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ انہوں نے میرے پاس کچھ دستاویز بطور امانت رکھوائی تھیں۔''

''کون سی.....؟'' سلیم صاحب نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ جس مکان میں آپ رہ رہے ہیں یا جو کاروبار آپ نے سنبھال رکھا ہے، وہ کس کا ہے؟''

''وہ تو..... میں تو.....'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

''میرے پاس موجود دستاویزات یہ بتاتی ہیں کہ یہ تمام کاروبار اور ملکیت میرے دوست کلیم کی ہیں۔ اسے جانے کیوں یہ یقین تھا کہ اس کی زندگی مختصر ہے، اس نے اپنی پراپرٹی کا مجھے پہلے ہی نگراں مقرر کردیا تھا اور اب اس تمام جائیداد کی واحد مالک پیاری سی بیٹی کرن ہے۔''

وہ یہ الفاظ ادا کرتے جا رہے تھے اور سلیم کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ جس کرن کو انہوں نے ملازمہ بنا کر رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، آج وہ ساری جائیداد کی مالک بن چکی تھی۔

''کرن بیٹی! یہاں آؤ۔ تمہاری عمر جب 18 سال ہوگی، تب تک میں تمہاری مدد کروں گا۔ اب تم سلیم صاحب کو اس گھر سے بھیج سکتی ہو، اس لیے کہ اس مکان کے ایک انچ پر بھی ان کا حق نہیں ہے۔'' وہ ہر بات تفصیل سے بتا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک ڈپلومے کے حصول کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے، اس لیے فوری طور پر یہ معاملہ حل کرنے نہ آسکے۔

''یہ میرے سگے چچا ہیں، میرا ان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔'' کرن نے معصومیت کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ''میں چاہوں گی کہ انہیں یہاں سے نہ نکالا جائے تاکہ میں اکیلی نہ رہ جاؤں۔ کاروبار بھی یہ چلائیں، آپ حساب کتاب کے معاملات کو دیکھتے رہیں۔''

اس ننھی سی بچی کے یہ جملے سن کر سلیم صاحب اپنی ہی نظروں میں گر چکے تھے۔ وہ ایک یتیم بچی کا سہارا بننے کے بجائے اس کی ملکیت پر قابض ہو چکے تھے لیکن آج اس کے ہاتھ سب کچھ آگیا تو اس نے ان سے اپنا بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دیا تھا۔ اس کی استانی اکثر کہا کرتی تھیں کہ لوگوں سے ظلم کا بدلہ تو لیا جا سکتا ہے لیکن اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دیا جائے تو اس سے بہتر عمل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

''انکل! آپ میرے ابو کے دیگر پروگراموں کے بارے میں بتائیے کہ وہ آئندہ کیا کرنا چاہتے تھے؟''

''بیٹا! ان کا ارادہ تھا کہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کیے جائیں۔ وہ دو ایک پراجیکٹ پر کام بھی کر رہے تھے۔''

''انکل! میں بھی یہی چاہوں گی کہ میرے ابو کی دولت فلاحی منصوبے پر صرف کی جائے۔ میں بھی اس مشن کو لے کر چلوں گی جو بچوں کی بھلائی اور تعلیم کے متعلق ہو۔''

وکیل صاحب کرن کی پُرعزم باتوں کو سن کر خوش ہوئے۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''میں اس عید پر ایسے بچوں تک عید کے کھلونے، کپڑے اور عیدی پہنچاؤں گی جو محض غربت کی وجہ سے عید کی خوشیوں میں شامل نہیں ہو سکتے۔'' اسے اپنا دکھ یاد تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ختم ہوا تھا۔

''بیٹی! اگر تم چاہو تو نیکی کے ان کاموں میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا۔'' سلیم صاحب نے آگے بڑھ کر اپنے عزم کا اظہار کیا تو کرن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔ آج اسے لگا کہ اس کے چچا نے اسے حقیقی طور پر گلے لگایا ہے اور وہ اب اس کے ابو کے مشن کی تکمیل میں اس کا ساتھ ضرور دیں گے۔ ☆☆☆

چھالا کیسے پڑتا ہے؟

اگر آپ کوئی بہت گرم چیز چھو لیں تو آپ کی جلد پر بلبلا سا بن جائے گا، جس کے اندر پانی ہوگا۔ اسی کو چھالا، آبلہ یا پھپھولا کہتے ہیں۔ نئے اور سخت جوتے کی رگڑ سے بھی پیر کی انگلی یا ایڑی میں چھالا پڑ جاتا ہے۔ اس کے اندر جو پانی ہوتا ہے، اسے لمف (Lymph) کہتے ہیں۔ یہ لمف جلی ہوئی جلد کی حفاظت کرتا ہے۔

چھالا دراصل ایک طرح کا حفاظتی خول ہوتا ہے جو جلد کے نیچے باریک نسیجوں (Tissues) میں جراثیم کو داخل ہونے سے روکتا ہے، اس لیے چھالے کو پھوڑنا نہیں چاہیے۔ چند روز بعد آپ ہی آپ مرجھا کر ختم ہو جائے گا۔

قطبی ریچھوں کو سردی کیوں نہیں لگتی؟

قطبی ریچھ قطب شمالی کے نہایت سرد اور برفیلے علاقے میں رہتے ہیں۔ ان کے گھنے اور چکنے بالوں کے نیچے چربی کی موٹی تہیں ہوتی ہیں جو انہیں گرم رکھتی ہیں۔ ☆☆☆

اَلْغَنِیُّ جَلَّ جَلَالُہٗ (سب سے بے نیاز)

الغنیُ جلّ جلالہٗ اپنی قدرت اور طاقت کی وجہ سے ساری مخلوق میں سے کسی کا محتاج نہیں اور ساری کی ساری مخلوق اس کے احسان اور اکرام کی محتاج ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہو جو محتاج ہو۔'' ہم لوگ کہتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ بے نیاز کا کیا مطلب!!!؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور باقی سب کے سب اس کے محتاج ہیں۔ ساری مخلوق اس کی تعریف کرنے لگ جائے تو اس کی بڑائی میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا اور اگر ساری مخلوق اس کی نافرمانی کرنے لگ جائے تو اس کی تعریف میں ذرہ برابر کمی نہ آئے گی بلکہ سب نافرمانوں کا اپنا نقصان ہے۔

اَلْمُغْنِیُ جَلَّ جَلَالُہٗ (غنی کرنے والا)

المغنی جلّ جلالہٗ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے غنی بنا دے۔ اللہ تعالیٰ ہی دُنیا میں فقیر کو مال دار بناتا ہے اور مال دار کو فقیر بنا کر دوسروں کی محتاجی سے بچاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ غنی مال سے ہو بلکہ غنی تو دل سے ہوتا ہے۔

دریا کے کنارے

پندرہ سالہ مراد خان دریائے راوی کے کنارے ایک بڑے گاؤں ''خوش حال'' میں رہتا تھا۔ اس بستی کے روڈ کے ساتھ دریائے راوی بہتا تھا۔ دریا کے کنارے بڑے بڑے پانچ ہوٹل تھے۔

یہ ہوٹل تفریحی مقام تھے۔ ان ہوٹلوں کی خاص بات فرائی مچھلی اور قسم قسم کے مختلف مچھلی کے کھانے تھے۔ ہر ہوٹل کے ساتھ دو تین بڑی بڑی کشتیاں تھیں۔ لوگ کھانا کھا کر کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے۔ لوگ دُور دراز سے تفریح کی غرض سے یہاں آتے اور اپنی پسند کی مچھلیاں پکواتے اور بڑے شوق سے کھاتے۔

مراد خان ایک غریب بچہ تھا۔ اس کا مچھلی کھانے کو بہت جی چاہتا مگر اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ مچھلی خرید سکے۔ لوگ اپنی کاروں میں آتے۔ آج موسم ابر آلود تھا اور فضا بھی ٹھنڈی تھی۔ ہوٹلوں میں بہت رش تھا۔ شام کو یہ بھی اپنے گھر سے نکلا اور ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتا رہا۔ بھُنی ہوئی مچھلیوں کو اپنے ہم عمر لڑکوں کو کھاتے دیکھتا تو اس کے منہ میں پانی بھر آتا۔

''بیٹا! کسی سے سوال نہیں کرتے صرف اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔'' ماں کی نصیحت اسے یاد آتی تو بھنی ہوئی مچھلی مانگنے کے لیے ہاتھ روک لیتا۔

ہوا کے دوش پر اس پورے علاقے میں بھُنی ہوئی مچھلیوں کی مہک ہی مہک تھی۔ آج اس کا بھی مچھلی کھانے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ آئے دن اس بے چارے کے ساتھ یہی کش مکش رہتی۔

وہ زاہد خان ہوٹل کے سامنے سے گزرا تو اس پر ایک بڑا قد آور پوسٹر لگا ہوا دیکھا۔

پوسٹر پر ایک بڑی مچھلی کی تصویر تھی جو دو آدمیوں کے برابر تھی۔

مچھلی کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''اسی کلو وزنی یہ مچھلی دریائے کابل سے شکار کی گئی۔''

وہ سوچتا: ''میں بھی دریا سے ہی مچھلی پکڑ کر کھا لوں، مگر میرے پاس تو مچھلی پکڑنے کا کانٹا ہی نہیں اور پھر پکڑوں گا کیسے؟'' یہ باتیں سوچتا سوچتا وہ دریا کے کنارے اداس ہو کر آ بیٹھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ دریا کے کنارے پانی میں بہتے بہتے اسے مچھلی اور کانٹا نظر آیا۔ اس کانٹے کے ساتھ ایک گوشت اور مچھلی پکڑنے کا ایک کیڑا بھی لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ڈور کسی سے دریا میں گر گئی ہے۔ اس نے وہ ڈور دریا کے کنارے میں پھینک دی۔ ابھی وہ ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ہو گیا۔ ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے ڈور وزنی ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً ڈور کھینچی تو ایک کلو کے وزن کے برابر مچھلی باہر جا گری۔ وہ بے اختیار خوشی سے چلاّ اُٹھا۔ اسے ڈور لینے کا کوئی ہوش نہ تھا۔ مچھلی اپنی جھولی میں ڈال کر وہ گھر کی طرف بھاگا۔

''امی......! امی......!'' اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے ماں کو مچھلی دکھائی۔

''بیٹا! کہاں سے لی ہے؟''

''امی! دریا سے پکڑی ہے۔''

''مگر کیسے!!'' ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے ماں کو اپنی وہ ساری سرگزشت بتا دی کہ اس کا دل بہت چاہتا تھا کہ مچھلی کھاؤں، مگر آپ کی بات یاد آ جاتی۔

''بیٹا! کسی سے سوال نہیں کرتے صرف اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے ماں کا دل ممتا کی محبت میں ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ وہ اتنی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ مچھلی خرید کر کھا سکیں۔

مچھلی کھا کر دونوں ماں بیٹے نے رب کا بہت شکر ادا کیا۔ پھر ماں نے اسے ایک واقعہ سنایا:

ایک مرتبہ ایک صحابی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان غنیؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور کچھ رقم حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور جواب میں فرمایا: ''کیا آپ کو میری بیٹیوں پر فقر و فاقہ کا اندیشہ ہے؟ میں نے تو انہیں ہر رات سورۂ واقعہ کی تلاوت کی تاکید کر رکھی ہے، کیوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ''جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ پڑھے اسے کبھی فاقے کی مصیبت نہیں آئے گی۔''

''مراد بیٹا! میری خواہش ہے کہ تم بھی یہ سورت یاد کر لو۔ یوں اللہ تعالیٰ فقر و فاقے سے بچا لے گا اور جو نعمت ملے، اس پر شکر کرو تو اللہ تعالیٰ وہ نعمتیں مزید عطا فرمائے گا۔''

مال دولت سے آدمی غنی اور امیر نہیں بنتا بلکہ جو دل کا غنی ہے وہ بڑا امیر ہے۔ آپ آئندہ سے یہ عزم کریں کہ کسی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بھی نہیں دیکھنا بلکہ اپنے اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہے۔ ماں کی باتوں سے مراد کا دل متاثر ہونے لگا۔ اس کا یقین مضبوط ہونے لگا۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا۔ وہ ایک ہوٹل کا مالک تھا۔ اس کے ہوٹل سے لوگ دُور دراز سے مچھلیاں کھانے آتے۔ اس ہوٹل کے سامنے کوئی بھی غریب یا کوئی بچہ گزرتا تو اسے وہ مچھلی کا گوشت دیئے بغیر آگے نہ جانے دیتا۔

آج وہ بھی اپنے ماضی میں کھو چکا تھا۔ اپنے ماضی کو یاد کر کے وہ پھر شکر ادا کرتا۔ یہی شکر اس کی کشادگی اور برکت کا سبب بنا تھا۔

دوسروں کا قرض ادا کروایئے

عزیز ساتھیو! آپ بہت سارے لوگوں کو دیکھیں گے کہ انہیں کسی نہ کسی کا قرض ادا کرنا ہے اور وہ اس سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔ آپ ان کی پریشانی ختم کروانے میں ان لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی خدمت میں ایک غلام آیا کہ مجھ پر قرض ہے۔ میں اسے ادا نہیں کر سکتا، آپ اس بارے میں میری مدد کر دیجیے۔ جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں وہ کلمات نہ سکھلا دوں جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے سکھائے تھے؟ اگر تم پر یمن کے پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس قرض کو ادا کر دیں گے۔ تم یہ دعا مانگا کرو:

اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ

ترجمہ: ''اے اللہ! تو مجھے حلال روزی عطا فرما اور حرام سے بچا اور اپنے فضل سے اپنے علاوہ ہر ایک کی محتاجی سے بچا۔''

☆☆☆

عید اور دیگر مذاہب کے تہوار

شیخ عبدالحمید عابد

روئے زمین پر مختلف اقوام اور قبائل آباد ہیں جو اپنے طور اور طریقوں سے اپنا کوئی نہ کوئی تہوار جوش وخروش سے مناتے ہیں۔طلوعِ اسلام سے قبل تک مختلف مذاہب کے دنوں کے بارے میں پتا چلتا ہے جسے وہ جشن عید کے طور پر مناتے چلے آرہے تھے۔کہیں کہیں ان میں مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔آیئے ان کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں۔

دُنیا میں سب سے پہلے تاریخی جشن عید اس وقت منایا گیا جب حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے ہابیل اور قابیل کی جنگ کے بعد صلح ہوئی۔اگرچہ بعد میں قابیل نے ہابیل کو قتل کرڈالا تھا۔

ضحاک ایک ظالم بادشاہ تھا جو حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیانی وقفہ میں حکمران رہا ہے اس کو فریدون نے شکست دی تھی۔ تاریخ میں یہ دن ''یوم الفتح'' کے نام سے لکھا ہوا ہے۔ اس دن رعایا نے ''عید مرجان'' منائی۔قوم ثمود بھی سال میں ایک عید مناتی تھی۔ یہ قوم معاشی اور اقتصادی اعتبار سے کافی مشہور اور خوش حال قوم تھی۔

خوشی کی ایک رسم حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بھی رائج تھی۔ قوم اس تہوار کو کھلے میدان میں جاکر مناتی تھی۔

اہلِ مصر اپنے دیوتاؤں کے جنم دن پر ان کی یادگار میں عید منایا کرتے تھے جس کا نام انھوں نے نو روز رکھا۔ اس دن عریانیت اور فحاشی کے مظاہرے کو وہ قابلِ قدر گردانتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم یہودی ہے جو ہر نئے چاند کا پہلا دن عید کی طرح منایا کرتی تھی۔ یروشلم کے معاہدے اور فتح کی تاریخ پر بھی ایک عید منائی جاتی تھی۔

قدیم یونانی اپنی فصل کاٹنے پر عید مناتے تھے۔

بدھ مت کے سب سے بڑے تہوار کا نام کالی وسا ہے جو لارڈ بدھا کی یاد میں منایا جاتا ہے۔مئی کے مہینے میں جب بھی چاند مکمل ہوتا ہے تو بدھ مت کے ماننے والے ٹیمپل میں جاتے ہیں اور سارا دن ٹیمپل میں گزارا جاتا ہے۔ عبادت کرتے ہیں اور رات کو چراغاں کرتے ہیں۔ رنگ برنگی لائٹیں جلائی جاتی ہیں۔ آئل لیمپ جلاتے ہیں، قندیل جیسے بڑے بڑے لیمپ جلائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی چند ایک چھوٹے چھوٹے تہوار منائے جاتے ہیں، مثلاً جون کے مہینے میں بدھا کی سری لنکا آمد کے موقع پر بھی ایک تہوار ہوتا ہے۔

پارسی مذہب کے ہاں دو تہوار بڑے جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں۔ 21 مارچ کو جشنِ نو روز منایا جاتا ہے جو کہ موسمِ بہار کی آمد کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔اس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ زیادہ تر نمازِ صبح کو ادا کی جاتی ہے۔کبھی کبھی دوپہر اور شام کو بھی نماز ادا کی جاتی ہے۔

مسیحی برادری حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر یوم عید مناتی ہے۔ ایسٹر اور کرسمس کے دونوں تہواروں پر چرچ میں عبادت ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے گھر ملنے جایا جاتا ہے۔ ایسٹر کا تہوار مسیحیوں کے لیے زیادہ خوشی کا باعث ہے کیوں کہ اس روز حضرت عیسیٰؑ مُردوں میں سے جی اُٹھے اور دوبارہ زندہ ہوئے اور کرسمس والے روز حضرت یسوع مسیح پیدا ہوئے۔ بہرحال مغرب کی دُنیا میں کرسمس کا تہوار بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ مسلمانوں کے قومی تہوار ہونے کے ساتھ ساتھ خوشیوں اور مسرتوں کے دن بھی ہیں۔ عیدالفطر تیس روزوں کے بعد آتی ہے جو مسلمان بڑے جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں عیدالفطر دُنیا بھر کے مسلمان پورے مذہبی جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ تمام مسلمان مساجد میں نہ صرف مذہبی روایات کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں بلکہ نماز کے بعد بغل گیر ضرور ہوتے ہیں۔ جس راستے سے نماز پڑھنے جاتے ہیں تو واپسی مختلف راستے سے آتے ہیں۔ راستے میں حمد وثناء کرتے جاتے ہیں۔ گھر آکر کوئی

میٹھی چیز خاص طور پر سویاں کھائی جاتی ہیں۔ پھر بچوں کو عیدی دی جاتی ہے۔ البتہ چند مسلم ممالک میں وہاں کی اپنی ثقافتی روایات اور کھانے پینے کی عادات کو اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

متحدہ عرب امارات میں خواتین اور مرد نماز پڑھنے مسجد میں جاتے ہیں جب کہ بچیاں گھروں میں اکٹھی ہو کر نماز پڑھتی ہیں۔ سات بجے تک تمام لوگ نماز سے فارغ ہو کر اپنا نیا لباس پہنتے ہیں۔ اس کے بعد دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں۔ نوجوان مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ عید کی تقریبات تین روز تک جوش و خروش سے جاری رہتی ہیں۔

سوڈان میں عید الفطر منانے کی کچھ روایات باقی عرب ممالک سے تھوڑی سی مختلف ہیں۔ سوڈان میں عید تین روز تک منائی جاتی ہے۔ پہلے روز مرد حضرات مساجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ واپس آ کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ پھر رشتہ داروں کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ بچوں کو عیدی ملتی ہے اور عیدی کی رقم بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ رات رشتہ داروں کے ساتھ گپ شپ کرتے گزر جاتی ہے۔

عید کا تہوار ہمارے ملک پاکستان میں بھی بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب صبح عید کی نماز ادا کرتے ہیں اور پھر رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دی جاتی ہے، بچوں کو عیدی دی جاتی ہے۔

ہمسایوں کے ہاں سویاں اور مٹھائی تو اب بھی بھیجی جاتی ہے لیکن عید پر کیک دینے کا سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ البتہ اب تو چاند رات کو ہی عید کیک اور مٹھائی دوستوں اور رشتہ داروں کو بھجوا دی جاتی ہے۔

چاند رات پر پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں مارکیٹ پر اچھا خاصا رش اور ہنگامہ رہتا ہے جب کہ دوسرے ممالک میں چاند رات پر اتنا زیادہ ہنگامہ اور اس قسم کا رش نہیں ہوتا۔

روایات میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی پہلی عید الفطر یکم شوال 2 ہجری مدینہ منورہ میں منائی۔ آنحضور ﷺ نے دو گانہ واجب کی امامت فرمائی۔ اس کے فوراً بعد ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ عید گاہ کا یہ مقام آج بھی موجود ہے جو مسجد عمامہ کے نام سے معروف ہے۔ یہی وہ مسجد عمامہ ہے جہاں آنحضورؐ اکثر نماز استسقاء اُمت کے ساتھ ادا کرتے رہے ہیں۔

مسجدِ نبوی میں قائم باب الاسلام سے اگر باہر نکلیں تو پیشِ نظر یہی عمامہ مسجد ہو گی۔ عید مسلمانوں کا وہ پہلا بڑا اجتماع ہے جو کہ مسلمانوں کو ایک جنگ کی فتح کے بعد نصیب ہوا۔ عید کے اس اجتماع میں جہاں مسلمان ماہِ رمضان کی رحمتوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، ساتھ ہی خدا کی فتح، نصرت اور سطوت و عظمت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

عید مسرت و شادمانی کا پیغام ہے۔ عید اسلامی تہذیب و ثقافت کا حسین منظر ہے کہ کس طرح اسلام اپنے ماننے والوں کو خوشی و مسرت کے مواقع فراہم کرتا ہے اور کس طرح اس مسرت و شادمانی میں خدا کی رحمتیں شامل ہوتی ہیں۔

عید کا بڑا اجتماع مسلمانوں میں اخوت و روا داری، بھائی چارے، محبت اور اتحاد و اتفاق کا آئینہ دار ہے۔ عید کی نماز کے بعد رشتہ دار، عزیز و اقارب اور دوست سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں جس سے محبت و پیار کے جذبات اُجاگر ہوتے ہیں۔

عید گاہ میں بچوں کے رنگ برنگ کے کپڑے پھولوں کے ہار اور بچوں میں عیدی کی تقسیم اور ان کے چہروں پر حسین مسکراہٹ ایسا روح پرور منظر پیش کرتے ہیں جس سے کوئی بھی ذی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عید کے موقع پر توحید و رسالت کے پیغام کو فروغ دینے کے لیے عظمت خداوندی کا اعتراف کرنے کے لیے تکبیریں پڑھی جاتی ہیں تاکہ دینِ اسلام کا پرچار بھی خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ جاری رہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں عید گاہ میں چاروں طرف گونج جاتی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ عید کے دن سفید کپڑے پہنتے۔ عزیز و اقارب، صحابہ کرامؓ اور دیگر مکاتب فکر کے لوگوں سے ملتے حتیٰ کہ آپ گلیوں میں پھرنے والے معصوم بچوں پر دستِ شفقت فرماتے اور اگر کوئی یتیم بچہ مل جاتا تو اسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیتے اور اس کی دل جوئی فرماتے جس سے ٹوٹے ہوئے دل بھی عید کی مسرتوں سے باغ باغ ہو جاتے۔ آپ اپنی دخترِ نیک اختر حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سے عید ملتے، ان کے احترام میں کھڑے رہتے۔ یوں یہ عید اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بچوں سے بھی پیار کی دعوت دیتی ہے۔ سبحان اللہ! کیا بے مثل اخوت کا مظاہرہ ہے۔ جس کی عملی تصویر ہمارے نبی معظم ﷺ نے پیش کر کے ہمارے لیے تقلید کی راہ ہموار کی ہے۔

ساتھیو! ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عید الفطر کے اس عظیم الشان موقع پر اس عزم کا اعادہ کریں کہ ہم خدا تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کریں گے اور اسلامی تعلیمات کو زندگی کا طرۂ امتیاز بنائیں گے۔

ہمیں عید الفطر کے موقع پر اس بات کا بھی عہد کرنا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں گے اور اسلام کے دشمنوں کا مل کر مقابلہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو!

☆☆☆

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن کی سورۃ توبہ میں کس مسجد کا ذکر آیا ہے؟

i۔ مسجد اقصیٰ ii۔ مسجد قباء iii۔ مسجد ضرار

2۔ علم المناظر کا امام کس عظیم مسلمان سائنس دان کو کہا جاتا ہے؟

i۔ ابن الہیثم ii۔ بوعلی سینا iii۔ جابر بن حیان

3۔ فرانس کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ سیام ii۔ گال iii۔ دھوی

4۔ فٹ بال کس ملک کا قومی کھیل ہے؟

i۔ برازیل ii۔ امریکہ iii۔ فرانس

5۔ پاکستان کا قومی پھول چنبیلی ہے، اس پھول کا دوسرا نام کیا ہے؟

i۔ گلِ حسن ii۔ گلِ یاسمین iii۔ گلِ نرگس

6۔ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے۔ شعر مکمل کیجیے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر ....

7۔ عالم جبروت کے کیا معنی ہیں؟

i۔ خوابوں کی دُنیا ii۔ فرشتوں کی دُنیا iii۔ روحوں کی دُنیا

8۔ وزن کی اکائی گرام ہے۔ ایک کلوگرام میں کتنے ملی گرام ہوتے ہیں؟

i۔ 100 ملی گرام ii۔ 1000 ملی گرام iii۔ 10 ملی گرام

9۔ غریبوں کا ٹانک کس میوے کو کہا جاتا ہے؟

i۔ پستہ ii۔ مونگ پھلی iii۔ انجیر

10۔ وہ کون سا کھیل ہے جس میں ہر کھلاڑی اپنی گیند سے کھیلتا ہے؟

i۔ بیڈمنٹن ii۔ گولف iii۔ کرکٹ

جوابات علمی آزمائش جون 2015ء

1۔ اصحاب الشجرہ 2۔ تین قسم 3۔ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
4۔ ملٹن 5۔ چھ مصرعے 6۔ شکرا 7۔ ابراہیم لودھی
8۔ نہج البلاغہ 9۔ نمکین پانی 10۔ حسرت موہانی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ مریم کاشف، حیدر آباد (150 روپے کی کتب)
☆ حافظ نمرہ رحمٰن، لاہور (100 روپے کی کتب)
☆ محمد شاہد، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
محمد حنفاء مغل، واہ کینٹ۔ ثاقب حسین، راول پنڈی۔ علینا اختر، کراچی۔ حسین اکمل قریشی، لاہور۔ عروج جمشید، لاہور۔ خدیجہ گل سید، چارسدہ۔ دانش کلیم بھٹی۔ محمد اشرف، راہوالی۔ علینا عامر، فیصل آباد۔ فہد امین، اسد امین، فرحین امین، گوجرانوالہ۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ لاریب ممتاز، لاہور۔ محمد شاہد، لاہور۔ نجم السحر، منڈی بہاؤ الدین۔ نمرہ افضل خالق، لاہور کینٹ۔ نمرہ افضل، وقاص افضل، جھنگ صدر۔ طلحہ خباب علی، تلہ گنگ۔ عریفۃ الستار، میانوالی۔ حنینہ زاہد، راول پنڈی۔ رانا محمد فہیم سعید، فیصل آباد۔ عمر مدثر، سیال کوٹ۔ مناہل خالد، راول پنڈی۔ محمد سلیم مغل، قصور۔ اسد محمد خاں، میانوالی۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ نمرہ فاروق، لاہور۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ رجب، ابوبکر عاصم، لاہور۔ محمد باسط خان، میانوالی۔ حافظ حاجی ہاشم، میانوالی۔ زوار احمد خواجہ، راول پنڈی۔ زوہیب خان۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ عثمان ظفر، رحیم یار خان۔ آمنہ غفار، اسلام آباد۔ عبدالحسیب، لیہ۔ ہانیہ ایمان، میانوالی۔ ایہام عارف، لاہور۔ عثمان غنی، لاہور۔ فضہ سکندر، سرگودھا۔ عبدالرحمٰن ملک، اٹک۔ ایمن زہرہ، بہاول پور۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ بلال یونس، سویداہ۔ ندا خان، پشاور۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ مطیع الرحمٰن، صفی الرحمٰن، لاہور۔ محمد اواب کمبوہ، فیصل آباد۔ محمد طیب اکرم، گوجرانوالہ۔ ایمان خلیق راجہ، واہ کینٹ۔ سعیہ وجیہہ ضیغم، پشاور۔ ایہام عارف، لاہور۔ فضہ عامر، لاہور۔ حمنہ معین، رحیم یار خان۔ عزت مسعود، فیصل آباد۔ سندس آسیہ، کراچی۔ مطیع الرحمٰن، پشاور۔ آصفہ جہانگیر، ملتان۔ نوشین احمد، گوجرانوالہ۔ محمد آفاق، قصور۔ افتخار احمد، خانیوال۔ ملائکہ مشتاق، گجرات۔ ارم فاطمہ، سیال کوٹ۔ کائنات صادق، راول پنڈی۔ ریحان انور، حیدر آباد۔ مریم صادق، فیصل آباد۔ کشف طاہر، رحیم یار خان۔ شازیہ ملک، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ زمان خان، مانسہرہ۔ اریب گل، ہری پور ہزارہ۔ شعیب عالم، قصور۔ کرن سعید، ملتان۔ ماریہ شیخ، ساہیوال۔ فرحین سلیم، اوکاڑہ۔ انعم گل، رحیم یار خان۔ محمد آصف، کراچی

ڈاکو: ''دولت دو گے یا جان؟''

کنجوس: ''جان لے لو دولت تو میں نے بڑھاپے کے لیے رکھی ہوئی ہے۔''

☆

اُستاد: ''وہ کون سی جگہ ہے جہاں بہت لوگ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی تنہا ہوتے ہیں۔''

شاگرد: ''کمرۂ امتحان۔'' (ضحویٰ رانا، ساہی وال)

چھوٹا بچہ باہر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ باپ نے فوراً پوچھا: ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا، مجھے سچ سچ بتا دو ورنہ میں بہت ماروں گا۔''

''یہ مجھے گلی میں پڑا ملا ہے۔'' بچے نے جواب دیا۔

''یہ واقعی گلی میں پڑا ملا ہے؟ تم سچ بول رہے ہو نا؟'' باپ نے شکی لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ابو! میں سچ بول رہا ہوں۔ آپ خود جا کر گلی میں دیکھ لیں...... ایک آدمی ابھی تک اسے سڑک پر ڈھونڈ رہا ہے۔'' بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔ (کظیمہ زہرہ، لاہور)

افسر نے اخبار میں ایک سروے رپورٹ پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر سیکرٹری کو مطلع کیا: ''آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ساٹھ لاکھ ٹی وی اور چالیس لاکھ باتھ رومز ہیں۔''

''اچھا جناب، لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟'' سیکرٹری سے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''یہی کہ بیس لاکھ آدمی نہائے بغیر ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔'' افسر نے سر کھجاتے ہوئے ذرا تشویش سے جواب دیا۔ (احور کامران رانا، لاہور)

ایک آدمی نے بیکری پر پیزے کا آرڈر دیا۔ سیلزمین نے پوچھا: ''جناب! پیزے کے چار ٹکڑے کروں یا آٹھ؟''

آدمی نے جواب دیا: ''چار ٹکڑے ہی کر دو، آٹھ کون کھائے گا۔''

(شہرونیہ ثناء، حیدر آباد)

ایک آدمی ایسی حالت میں کھڑا تھا کہ پیروں اور کپڑوں پر ریت اور سر پر لہو تھا۔ کسی نے پوچھا ایسے کیوں کھڑے ہو۔

وہ فوراً بولا: ''دوست نے پھول مارا تھا۔''

''مگر پھول سے خون کیسے نکل آیا؟'' دوسرے آدمی نے تعجب سے پوچھا۔ ''دراصل پھول کے ساتھ گملا بھی تھا۔'' جواب ملا۔

(تماضر ساجد، صادق آباد)

ایک کنجوس نے ایک رسالہ میں خط لکھا: ''جناب! اگر آپ نے کنجوسوں کے بارے میں لطیفے شائع کرنا بند نہیں کیے تو میں رسالہ پڑوسی سے لے کر پڑھنا بند کر دوں گا۔'' (اسامہ ظفر راجہ، کھبولہ)

ایک کنجوس آدمی جب گھر میں داخل ہوا تو کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر وہ کنجوسی کا فتویٰ لگا سکے۔ حسبِ عادت کوئی چیز نظر نہ آئی تو اپنی بیگم سے بولے: ''بیگم اتنی فضول خرچی نہ کیا کرو۔ اب دیکھو، جب ایک چٹیا سے کام چل سکتا ہے پھر دو چٹیاں باندھنے کا فائدہ؟

☆

دوست (دوسرے دوست سے): ''میرے دانت تو چاندی کی طرح سفید ہیں۔''

دوسرا دوست: ''اس میں کون سی بڑی بات ہے، میرے دانت تو سونے کی طرح پیلے ہیں۔'' (لائبہ عرفان، کراچی)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''یہ آج پارک میں اتنا کچرا کیوں پھیلا ہوا ہے، اس سے پہلے تو میں نے پارک میں اتنے کاغذ بکھرے ہوئے نہیں دیکھے۔''

دوسرا دوست: ''کل پارک میں آنے والوں میں پمفلٹ تقسیم کیے گئے تھے کہ براہِ مہربانی صفائی کا خیال رکھیں اور کوڑا کرکٹ مقررہ جگہوں پر پھینکیں، یہ سب وہی پمفلٹ ہیں۔''

☆

فقیر دروازے پر کھڑی خاتون سے بڑی عاجزی سے بولا: ''بیگم صاحبہ! آپ کی پڑوسن نے مجھے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا ہے۔ آپ بھی خدا کے نام پر میرے لیے کچھ کیجیے۔''

خاتون بولیں: ''ضرور! تم ٹھہرو، میں تمہارے لیے بدہضمی کی دوا لاتی ہوں۔''

(زنل رانا، لاہور)

انسان

انسان اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ وہ باقی مخلوق سے صرف اس لیے اشرف و افضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل اور علم سے نوازا ہے۔ دُنیا میں جو انسان نور ایمان سے منور ہو کر اپنی فکری اور علمی قوتوں سے کام لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں دُنیاوی اور اخروی کام یابیوں سے ہم کنار فرمائے گا۔

(جویریہ یونس، لاہور)

بانیٔ پاکستان

یہ 14 اگست 1947ء کی خوب صورت شام تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے وسیع وعریض چبوترے پر قائداعظم محمد علی جناحؒ مسکرا مسکرا کر اپنے مداحوں سے مبارکباد وصول کر رہے تھے۔ ایک غیر ملکی صحافی نے قائداعظم سے کہا: ''آپ کتنے خوش نصیب ہیں۔'' آپ نے آج اپنی قوم کے لیے ملک حاصل کرلیا آپ بانی پاکستان ہیں۔

قائداعظم نے جواب دیا: ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی میں بن گیا لیکن میں پاکستان کا بانی نہیں ہوں۔''

غیر ملکی صحافی (تعجب سے): ''اگر آپ اس ملک کے بانی نہیں تو پھر کون ہیں؟''

قائداعظم نے جواب دیا: ''ہر ایک مسلمان۔'' (دُرِمکنون، گجرات)

انوکھی دُعا

عراق میں ایک درویش کا بہت چرچا تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کو اس سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ایک روز اس نے اسے طلب کیا اور کہا: ''اے درویش! میرے لیے دعائے خیر کر۔'' درویش نے فوراً ہاتھ اُٹھا کر کہا: ''الٰہی! اسے موت دے دے۔'' حجاج نے جز بز ہو کر کہا: ''واہ! یہ کیا دعا ہوئی؟'' درویش نے جواب دیا۔ ''یہ دعائے خیر ہے تیرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔'' حجاج نے پوچھا: ''وہ کیسے؟'' درویش بولا: ''تو ظلم کرنے سے چھوٹ جائے گا اور دوسرے تیرے ظلم سے نجات پالیں گے۔'' (قمر ناز دہلوی، کراچی)

غیر ملکی ضرب الامثال کہاوتیں

☆ پُرانے جوتے اس وقت تک نہ پھینکو جب تک نئے جوتے نہ مل جائیں۔ (جرمن ضرب المثل)

☆ بھیڑ کا شکار کرنے سے بھیڑیا غم زدہ نہیں ہوتا۔ (تیلگو ضرب المثل)

☆ اگر ڈاکٹر تمہارا دوست ہو جائے تو اس کو سلام کرو اور دشمن کے گھر بھیج دو۔ (ولندیزی ضرب المثل)

☆ کبھی اپنی تھیلی کی اور دل کی تہہ نہ دکھاؤ۔ (اٹلی کی ضرب المثل)

☆ روپے بچانا روپے کمانے جیسا ہے۔ (اسپینی کہاوت)

☆ جھوٹ بولنا کوٹھے (چھت) سے گرنا ہے۔ (افغان کہاوت)

☆ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ (پاکستانی ضرب المثل)

(ثریا عبدالستار انصاری، چوہنگ لاہور)

خواہش

ہم خواہش تو کرتے ہیں مگر کوشش نہیں کرتے لیکن جس دن ہم نے خواہش کرنے کے ساتھ ساتھ کوشش بھی کی تو کوئی کام ناممکن نہیں رہے گا۔ کام یابی ہمارا مقدر ہوگی۔ زندگی میں کبھی کبھار خواہش پوری نہیں ہوتی لیکن کوشش ہر حال میں کام یاب ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ دیر یا جلد ضرور آتا ہے۔ سو انسان کو آخری لمحات تک کوشش کرنی چاہیے۔ کوشش اور اُمید کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہماری ہر کوشش میں کام یابی چھپی ہوتی ہے، نظر نہ آنے والی کام یابی۔ وہ تب عیاں ہوتی ہے جب ہم کوشش کرتے ہیں۔ ہم کوشش ہی نہیں کرتے اور قصور وار اپنی قسمت کو ٹھہرانے لگ جاتے ہیں۔

(کنزیٰ جدون، میرپور ایبٹ آباد)

اقوال زریں

☆ زندگی میں وہی کام یاب ہوتا ہے جو بڑوں کی عزت کرتا ہے۔

☆ علم ایسا خزانہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔

☆ ماں باپ خدا کا انمول تحفہ ہوتے ہیں۔

☆ اگر جنت میں جانا چاہتے ہو تو ماں باپ کی عزت کرو۔

☆ ہر حالت میں سچ بولو۔

☆ سچ جنت کی طرف لے کر جاتا ہے۔

☆ تعلیم انسان کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے۔

☆ علم ایک طاقت ور تلوار ہے۔

☆ اگر ہم دوسروں کی مدد کریں گے تو اللہ ہماری مدد کرے گا۔

☆ محنت کامیابی کا راز ہے۔ (فاطمہ زاہد، ٹیکسلا)

اچھی باتیں

☆ اگر کسی قوم کو بغیر جنگ کے شکست دینی ہو تو اس ملک کے نوجوانوں میں بُرائی پھیلا دو۔

☆ دُنیا میں عزت مال سے ہے اور آخرت میں عزت اعمال سے۔

☆ صبر کی کڑواہٹ، علم کی مٹھاس اور عمل کی سختی وہ دوا ہے، جس سے دل کی خرابی کا علاج ہوتا ہے۔

☆ ہر لفظ سوچ سمجھ کر ادا کرو، کیوں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر بھی واپس نہیں آ سکتا۔ (امامہ حبیب، لاچی کوہاٹ)

تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت ہے پیارا سب کی آنکھوں کا تارا
اس سے واقف ایک جہاں بچے ، بوڑھے اور جواں
تعلیم و تربیت لاتے ہیں ہم گھر کو اس سے سجاتے ہیں ہم
نظمیں اور کہانیاں پڑھ کر بچوں کو سناتے ہیں
لطائف پڑھ کر اور سنا کر تماضر ہنستے اور ہنساتے ہیں ہم
(تماضر ساجد، صادق آباد)

سنہری اصول (عادات و اطوار)

☆ تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔

☆ جب گھر میں داخل ہوں تو اہل خانہ کو سلام کرو۔ (جامع ترمذی)

☆ سلام کرنے میں پہل کرو کیوں کہ سلام میں پہل کرنے والا اللہ کے قرب اور رحمت کا زیادہ حق دار ہے۔ (احمد ترمذی، ابوداؤد)

☆ السلام علیکم کہنے پر دس نیکیاں، وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ کہنے پر تیس نیکیاں اور جواب دینے والے کے لیے اتنی ہی نیکیاں۔

☆ کھانا شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہو اور اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (بخاری مسلم)

☆ چھینکنے والا اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہے اور سننے والا یَرْحَمکَ اللّٰہ کہے۔ (مسلم)

☆ غیر کے گھر میں مت جھانکو کیوں کہ غیر کے گھر میں جھانکنا حرام ہے۔ (مسلم)

☆ مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو، یہ بھی نیکی ہے۔ (جامع ترمذی)

☆ لوگوں سے اچھی اور میٹھی بات کرو کیوں کہ یہ بھی صدقہ ہے۔ (بخاری)

☆ صلہ رحمی (قریبی رشتہ داروں سے احسان اور حسن سلوک) کرو اللہ تعالیٰ تمہارے رزق میں کشادگی و کشائش اور عمر میں درازی عطا فرمائیں گے۔

☆ قطع رحمی (قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلق) ہرگز نہ کرو کیوں کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہو گا۔ (حمزہ یاسر، لاہور)

ہر بات سے موتی چمکے

☆ سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ کے اندر حوصلہ باقی ہے تو سمجھ لیں کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

☆ چپ رہنا بھی اتنا ہی بڑا کام ہے جتنا بحث کرنا۔

☆ مصائب سے مت گھبراؤ کیوں کہ ستارے اندھیرے ہی میں چمکتے ہیں۔

☆ حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

☆ دوستی ایک کچے دھاگے کی مانند ہے، ایک بار ٹوٹ جائے تو جڑ تو جاتی ہے مگر اس میں گرہ آ جاتی ہے۔

☆ مواقع کو استعمال کرنے کا نام قیادت ہے، جب کہ موقع کو برباد کر دینا حماقت ہے۔ (مریم نایاب، نوشہرہ)

دوستی

جب کسی سے دوستی کرنی ہو تو اس سے جنگ نہ کرو۔ اس پر اپنی برتری کا اظہار نہ کرو۔ اس کی نگرانی نہ کرو اور دوسروں سے اس کے بارے میں پوچھتے نہ پھرو کیوں کہ ممکن ہے کہ اس کے بارے میں کوئی تمہیں غلط بات بتا دے اور یہ غلط بات ایک اچھے دوست کے کھونے کا سبب بن جائے۔ (عروج ماہین، پنڈ دادنخان)

محبت

☆ محبت کی شان یہ ہے کہ وفا سے بڑھتی ہے اور جفا سے گھٹتی نہیں۔

☆ محبت کا ماتم اور محبت کی خوشیاں، دونوں آنسوؤں سے ہی کی جاتی ہے۔

☆ مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔

☆ محبت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ سب کچھ محبوب کی راہ میں قربان کر دو۔

☆ زندگی ایک پھول ہے اور محبت اس کا شہد ہے۔

(مزمل سلیم قادری، گوجرانوالہ)

☆☆☆

آج سے پندرہ سو برس پہلے کا ذکر ہے کہ یمن کے ایک چھوٹے سے علاقے میں ایک قبیلہ آباد تھا جس کا نام "قبیلہ طے" تھا۔ یہ بھیڑ بکریاں چرانے والے لوگ تھے۔ کچھ اونٹ بھی پالے ہوئے تھے اور اپنے علاقے میں جانور پال کر گزارا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں عرب کی زندگی بڑی سادہ سی تھی۔ اپنے علاقے پر حکومت بھی انہی لوگوں کی تھی۔ قبیلے کا ایک سردار تھا جس کا نام حاتم طائی تھا۔ اصلی نام حاتم تھا لیکن طے قبیلے سے تعلق تھا، اس وجہ سے طائی کہلاتا تھا۔

حاتم طائی جوان، حسین، صحت مند اور خوش اخلاق انسان تھا لیکن ان سب کے باوجود اس کی ایک خوبی ایسی بھی تھی جو اسے سب سے ممتاز کرتی تھی اور بڑا بناتی تھی، وہ اس کی سخاوت تھی۔

حاتم غضب کا سخی اور کریم تھا۔ ہر وقت اوروں کی مدد کرنے کو تیار رہتا۔ علاقے میں جو مسافر آتا، اس کا مہمان بنتا۔ اس کے دروازے غریب، امیر سب کے لیے ہر وقت کھلے رہتے۔ لوگ حاتم کے دسترخوان سے دو وقت کا کھانا کھاتے اور دعائیں دیتے۔ سخاوت کی عادت حاتم میں اتنی بڑھ چکی تھی کہ کسی نے کم مانگا، اس نے زیادہ دیا۔ کسی نے تھوڑا چاہا، اس نے زیادہ پیش کیا حتیٰ کہ جس نے نہ بھی مانگا حاتم نے اسے بھی کچھ نہ کچھ انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کا دل ہر وقت یہ چاہتا تھا کہ لوگوں پر خرچ کرتا رہے اور اس مقصد کے واسطے وہ جان کو جان اور مال کو مال نہیں سمجھتا تھا۔

اس زمانہ میں عرب کا سردار نوفل نامی بادشاہ تھا۔ نوفل بھی بہت سخی تھا۔ چوں کہ سارا عرب اس کے زیرِ حکومت تھا، چناں چہ آمدنی بہت ہوتی۔ شاہی خزانہ ہر وقت بھرا رہتا، اس لیے اسے سخاوت کرتے ذرا بھی مشکل نہ پیش آتی۔ اس بادشاہ کی بھی یہ عادت تھی کہ جو کوئی مانگنے والا اس کے دربار میں آیا، خالی نہ لوٹا۔

ایک بات اور بھی تھی، وہ یہ کہ نوفل بادشاہ کی سخاوت ذرا دکھلاوے کے لیے بھی تھی۔ حاتم سخی تھا تو دل کا سخی تھا لیکن نوفل بادشاہ محض سخاوت کی عزت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل زیادہ سخی نہ تھا۔ اسی لیے وہ جسے نوازتا اس سے یہ اُمید بھی کرتا کہ وہ اس کی تعریف کرے جب اپنے تعریف کا اسے اتنا شوق تھا تو وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے ہوتے لوگ حاتم کے گن گائیں۔ چناں چہ جہاں کہیں وہ سنتا کہ حاتم نے کوئی چیز تقسیم کی یا کوئی صدقہ دیا یا کسی کو کسی چیز سے نوازا تو ضد میں آکر اس سے دوگنا سخاوت کرتا لیکن افسوس اس کی یہ ساری محنت رائیگاں جاتی اور لوگوں کے لبوں پر حاتم کا نام ہی رہتا۔

آہستہ آہستہ نوفل، بادشاہ حاتم سے حسد کرنے لگا اور دل ہی دل میں اس کی دریا دلی سے جلنے لگا۔

کہتے ہیں حاسد اپنی ہی آگ میں جلتا رہتا ہے اور اسے کسی پل

چین نہیں آتا۔ یہی حال نوفل کا ہو گیا۔ ادھر کسی نے حاتم کا نام لیا نہیں اور ادھر اسے غصہ آیا نہیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر آخر ایک دن اس کے وزیر نے اسے ایک خاص مشورہ دیا۔ مشورہ یہ تھا کہ کسی طرح نوفل بادشاہ حاتم طائی کو آزمائے کہ آیا وہ صحیح معنوں میں سخی اور کریم ہے بھی یا نہیں؟ چناں چہ منصوبے کے تحت نوفل نے اپنے ایک آدمی کو ایک دن حاتم کے پاس بھیجا کہ اس سے وہ گھوڑا مانگے جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ حاتم طائی کے پاس ایک سرخ رنگ کا طاقت ور گھوڑا تھا۔ ایسے رنگ والے گھوڑے عام طور پر عرب میں نہیں پائے جاتے۔ حاتم کو وہ بہت پیارا تھا۔ نوفل نے اپنے آدمی کے ذریعے حاتم سے اسی گھوڑے کا سوال کیا کہ دیکھیں حاتم دیتا بھی ہے یا نہیں۔

وہ آدمی عرب کے مرکز سے چلا اور منزلوں پر منزلیں مارتا ہوا شام کو کہیں جا کر قبیلہ طے کے علاقے میں پہنچا۔ حاتم سے ملاقات ہوئی۔ حاتم اپنے معمول کے مطابق بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا اور مہمان کا ہاتھ منہ دھلایا۔ رات گہری ہو چلی تھی، حاتم نے مشورہ دیا کہ ”اے نیک انسان! تم مسافر ہو، پہلے کھانا کھا لو، پھر آرام کر لو صبح میری تمہاری یہیں ملاقات ہو گی۔ تمہارا جو بھی کام ہو گا، صبح میں حاضر ہوں گا۔ اب تم تھکے ہوئے ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمہیں زیادہ جاگنا پڑے۔“

بات معمولی تھی۔ وہ آدمی کھانا کھا کر سو گیا۔ صبح دن چڑھے بیدار ہوا تو حاتم پہلے سے اس کے لیے ناشتا لیے موجود تھا۔ ناشتے کے بعد اس شخص نے اپنے آنے کی غرض بیان کی: ”نوفل بادشاہ تم سے وہ گھوڑا مانگتا ہے جسے تم نے بڑے لاڈ سے پال رکھا ہے۔“

مسافر کی بات سن کر حاتم نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر یوں ہی گزر گئی۔ وہ آدمی سمجھا کہ یہ تھی حاتم کی سخاوت! ایک گھوڑے پر اس کی بس ہو گئی۔ چناں چہ اس نے اسے تسلی دی اور کہا کہ کوئی بات نہیں، اگر وہ گھوڑا نہ دینا چاہے تو نوفل کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

”یہ بات نہیں ہے دوست۔“ حاتم نے اس کی بات سن کر سر اُٹھایا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ رات جب تم آئے تو تھکے ہوئے تھے، تمہیں بھوک بھی زوروں کی لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے میرے پاس اس گھوڑے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے خادم کو حکم دیا کہ مہمان کے لیے اسی کو ذبح کر دے۔ مجھے افسوس ہے دوست میں تمہارے کام نہ آ سکا۔ میرے پاس اب وہ گھوڑا نہیں ہے ورنہ تو میری جان بھی حاضر تھی۔“

اس زمانہ میں گھوڑے کا گوشت کھانا جائز تھا۔ یہ آج سے پندرہ سو سال پہلے کی بات ہے۔

نوفل کا آدمی یہ بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور کچھ دیر حاتم طائی کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کی مہمان نوازی کی تعریف کی اور واپس عرب چلا آیا۔

نوفل نے جب اپنے خاص آدمی سے سارا واقعہ سنا تو اسے اور بھی حیرت ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ آخر کیسے وہ حاتم کو نیچا دکھائے۔

اب حال یہ ہو گیا تھا کہ نوفل کے اپنے آدمی بھی ہر وقت حاتم حاتم کرنے لگے تھے۔ نوفل کچھ عرصہ تو یہ سب برداشت کرتا رہا، آخر ایک دن اس نے یمن پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا۔ اس جنگی مشن میں اس کے خوشامدی درباریوں نے اسے خوب اُکسایا اور یہ بات اس کے ذہن میں ڈال دی کہ اگر کسی طرح وہ حاتم کے علاقے اور قبیلے پر قبضہ کر لے تو سارے عرب میں اس کے نام کا ڈنکا بج جائے گا۔

دوسری طرف حاتم طائی نے جب یہ سنا کہ نوفل جنگ کے ارادے سے اس کے علاقے کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے یہ سوچا کہ سارے فساد کی جڑ میں ہوں۔ میری وجہ سے ہی یہ سب خون خرابا ہونے جا رہا ہے۔ اگر میں ہی اس علاقے سے نکل جاؤں تو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ چناں چہ اپنے اور نوفل کے فوجیوں کو جنگ و جدل سے بچانے کے لیے وہ راتوں رات اپنے گھر سے نکلا اور جنگل کے قریب پہاڑ کی کھوہ میں جا کر چھپ گیا۔ کھوہ پہاڑ کی درز کو کہتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی ہوتی ہے کہ درمیانے قد کا ایک آدمی آسانی سے اس میں سما جاتا ہے۔ چلتے وقت حاتم نے یہ عقل مندی کی کہ چند دن کا کھانا ساتھ لے لیا۔

نوفل نے اپنی جنگ کی قسم پوری کی۔ اس نے حاتم کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ طے قبیلے کے لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ مال و اسباب سب لوٹ لیا اور وہ جانور اور ڈھور ڈنگر جنہیں وہ لوگ چرایا کرتے تھے، اپنے قبضے میں کر لیے۔ حاتم وہاں تھا ہی نہیں۔ یہ سب کرنے کے بعد بھی نوفل کو چین نہ آیا کیوں کہ وہ تو حاتم کو قتل کروانا چاہتا تھا تاکہ نوفل کے نام کی پوجا ہو اور اسے سب سخی کہیں۔

جب حاتم اسے نہ ملا تو اس نے اعلان کروایا کہ جو شخص حاتم کو ڈھونڈ لائے گا، اسے ایک ہزار اشرفیاں (سونے کے سکے) انعام ملیں گے۔ جو حاتم کا پتا بتائے گا یا اس کی مخبری کرے گا، اسے بھی یہی انعام

دیا جائے گا۔ یہ بات سارے عرب میں پھیل گئی۔ ہر شخص انعام کے لالچ میں حاتم کو تلاش کرنے لگا۔

دوسری طرف حاتم ان سب باتوں سے بے خبر، اس کھوہ میں گم نامی اور نظر بندی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنے حال پر خوش تھا کہ شاید خدا کی یہی مرضی ہے۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک بوڑھا لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں چنتا ہوا اس طرف آیا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ لکڑہارے کا نام ابو زید اور اس کی بیوی کا نام ام زید تھا۔ گھومتے گھماتے وہ اسی کھوہ کے قریب آ گئے جس میں حاتم چھپا ہوا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔

ابو زید کہنے لگا: ”ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، ہمارے جسم کمزور ہو گئے ہیں لیکن کیا مصیبت ہے کہ روزانہ میلوں چل کر لکڑیاں اکٹھی کرتے ہیں تب کہیں جا کر چولہا جلتا ہے، ہائے ہماری قسمت بھی کتنی خراب ہے۔“

”اف اللہ جی!“ ام زید کہنے لگی۔ ”بڑھاپے سے بڑی بیماری کوئی ہے؟ ساری زندگی کام کاج میں گزاری اب ہڈیاں گل چکی ہیں لیکن محنت سے جان پھر بھی نہ چھوٹی۔ کاش کہیں سے حاتم ہمارے ہاتھ لگ جاتا تو ہمارے بھی دن پھر جاتے۔“

”حاتم ہاتھ لگ جاتا، کیا مطلب ہے تیرا؟“ ابو زید نے اسے جھڑکا۔ ”تجھے نہیں معلوم ہم بدقسمت لوگ ہیں، بھلا کہاں سے حاتم ہمارے ہاتھ آ جائے گا اور کہاں ہم اسے نوفل کے حوالے کر کے ہزار اشرفیاں لے لیں گے۔ ہماری قسمت میں تو یہی مشقت لکھی ہوئی ہے اور بس...... چل اِدھر دیکھ...... وہ لکڑی اُٹھا۔“

حاتم کھوہ میں چھپا ساری باتیں سن رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نوفل اس کے علاقے پر قابض ہو چکا ہے اور اس نے اس کے سر کی قیمت ایک ہزار اشرفیاں مقرر کی ہیں۔ اس موقع پر حاتم کے خون نے جوش مارا اور اس کا وہی جذبہ بیدار ہو گیا جو اسے دوسروں کی مدد پر اُبھارتا تھا۔ چناں چہ اس نے سوچا میں کبھی نہ کبھی مر تو جاؤں گا، کیوں نہ کسی کے کام آ کے مروں۔ اگر یہ بوڑھا مجھے نوفل کو پیش کر دے اور انعام پا لے تو کتنا اچھا ہو؟ چناں چہ یہی سوچ کر وہ کھوہ سے نکلا اور بوڑھے سے کہنے لگا:

”ذرا ٹھہرو بڑے میاں ... میں ہی حاتم ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے ... لو میرا ہاتھ پکڑو اور مجھے نوفل بادشاہ کے حوالے کر کے انعام لے لو۔“

بوڑھے کے چہرے پر حیرانی کے اثرات نمودار ہو گئے۔ اس نے کہا: ”شکل سے تو تم عقل مند دکھائی دیتے ہو لیکن باتیں عجیب کرتے ہو۔ ذرا پھر سے دہرانا تم نے کیا کہا؟“

حاتم یہ سن کر قریب آ گیا۔ میں نے کہا: ”بڑے میاں، میں ہی حاتم ہوں۔ اگر تم مجھے لے جا کر نوفل کے حوالے کر دو تو تمہیں ایک ہزار سونے کے سکے مل جائیں گے، تمہارا بڑھاپا تو سکون سے گزر جائے گا۔ لو آگے بڑھو...... میرا ہاتھ تو تھامو۔“

”ہرگز نہیں۔“ بوڑھے نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے ساری زندگی شرافت سے گزاری ہے...... بھلا میں یہ کام کیوں کرنے لگا کہ

کسی شریف آدمی کو اس ظالم کے حوالے کروں اور انعام پاؤں...... میں ہرگز ایسا نہ کروں گا، رکھے نوفل اپنی اشرفیاں اپنے پاس۔"

"نہیں، نہیں بڑے میاں۔" حاتم ضد کرنے لگا۔

"ذرا سوچو تو...... کسی نہ کسی دن میں نے گرفتار ہو ہی جانا ہے تو پھر آج ہی کیوں نہیں اور پھر تمہارے ہاتھوں سے ہی کیوں نہیں۔"

اب دونوں طرف سے تکرار ہونے لگی۔ حاتم گرفتاری کی ضد کرتا اور بوڑھا خود داری کی۔ اتنی دیر میں ایک اور لکڑہارا اس طرف آ نکلا۔ پھر کہیں سے کوئی کسان بھی آ گیا، پھر کچھ اور لوگ بھی ان کی طرف آ گئے۔ یوں ذرا سی دیر میں مجمع اکٹھا ہو گیا۔

"اچھا بڑے میاں، حاتم نے بھیڑ دیکھ کر کہا۔ "اگر تم مجھے نوفل کے پاس نہیں لے جاتے تو میں خود جاتا ہوں اور اسے کہتا ہوں کہ مجھے گرفتار کرنے والا یہ بوڑھا لکڑہارا ہے۔"

حاتم کے اپنے منہ سے اس کا نام سن کر لوگوں کو پتا چلا کہ یہی نوجوان حاتم ہے، چناں چہ انہوں نے بڑھ کر ہاتھ ڈالا اور اس کے بازو جکڑ لیے۔ ہر شخص دعویٰ کرنے لگا کہ حاتم کو اس نے گرفتار کیا ہے۔ یوں یہ سارا مجمع نوفل کے دربار کی طرف چل پڑا۔ بوڑھا لکڑہارا اور اس کی بیوی بھی افسوس کرتے ساتھ ہو لیے۔

نوفل نے جب اپنے سامنے حاتم کو پایا تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا: "حاتم کو کون گرفتار کر کے لایا ہے؟"

"میں جناب۔" ایک آدمی آگے بڑھ کر کہنے لگا۔ "بھلا میرے سوا یہ کام کون کر سکتا تھا؟ میں تو کھوجی ہوں کھوجی! حاتم پاتال میں بھی چھپ جاتا تو میں اسے ڈھونڈ نکالتا۔" "چل ہٹ پرے۔" دوسرے نے اسے دھکا دیا۔ "حاتم کو میں نے گرفتار کیا ہے۔ میں کئی دن سے اس کی تلاش میں تھا، آخر بچ کے کہاں جاتا، آج ہاتھ تو آ ہی گیا ناں۔"

"بادشاہ سلامت!" تیسرا شخص کہنے لگا۔ "یہ دونوں جھوٹ بکتے ہیں، حاتم کو میں نے پکڑا ہے۔ آج پہاڑ کے پاس میں نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے بھاگنے کی بڑی کوشش کی لیکن جناب عالی، میں پہلوان ہوں۔ مجھ سے بھلا یہ کیسے بچ سکتا تھا؟ دیکھئے ابھی بھی اس کی کلائی میرے ہاتھ میں ہے۔"

ایک چوتھا آدمی اپنا کارنامہ بیان کرنے لگا کہ حاتم کو اس نے گرفتار کیا ہے۔ آخر یہ بحث اتنی بڑھی کہ نوفل کے جلاد نے کوڑا نکال لیا اور سب کو جھڑکی دی۔

جلاد کا کوڑا دیکھ کر سب چپ ہو گئے اور ذرا دیر کو دربار میں سناٹا چھا گیا۔ پھر نوفل نے خود حاتم سے پوچھا کہ وہ بتائے کہ اسے کس نے گرفتار کیا ہے تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کیوں کہ سات آٹھ آدمی اس بات کا دعویٰ کر رہے تھے۔

بوڑھا بوڑھی اس دوران ایک طرف ہٹ کر کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ حاتم آگے بڑھا اور ان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: "بادشاہ سلامت! سچ پوچھیے تو وہ بوڑھا لکڑہارا اور اس کی بیوی مجھے سب سے پہلے پکڑنے والے ہیں۔"

بادشاہ نے بوڑھے کو قریب بلایا اور کہا: "اے بزرگ! سچ سچ بتا...... سارا قصہ کیا ہے؟"

بوڑھے نے ڈرتے کانپتے سارا قصہ کہہ سنایا کہ حاتم کو کسی نے گرفتار ہی نہیں کیا بلکہ یہ خود ہی ان کی مدد کے جذبے سے یہاں چلا آیا۔

نوفل نے جب یہ بات سنی تو حیران رہ گیا۔ اسے اُمید ہی نہ تھی کہ حاتم ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ میں اگر ساری زندگی بھی زور لگاتا رہوں تو حاتم کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو پیدائشی سخی ہے اور اسے تو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی سخاوت کے لئے کیا ہے۔ چناں چہ اس نے حاتم کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ بوڑھے اور اس کی بیوی کو ایک ہزار اشرفیاں دی جائیں اور جو لوگ جھوٹے دعوے کر رہے تھے، انہیں دس دس کوڑے لگائے جائیں۔

اگلا دن بہت سی خوشیاں لے کر طلوع ہوا۔ نوفل نے حاتم کی سرداری تسلیم کی۔ اس کے قبیلے والوں کو آزاد کیا، ان کا لوٹا ہوا مال و اسباب انہیں واپس کیا۔ اس کے بعد تمام لوگوں کے سامنے اس سے اپنے اس سلوک کی معافی مانگی اور عرب کو واپس لوٹ گیا۔

جانے سے پہلے اس نے حاتم کو اپنی تلوار تحفے کے طور پر پیش کی جسے حاتم نے قبول کر لیا۔

حاتم طائی عرب کا سخی ترین شخص تھا، یہی وجہ ہے کہ عربی تاریخ کی ہر کتاب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ لوگ حاتم کی سخاوت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حاتم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ نے مکہ میں نبوت کا اعلان کیا۔ حاتم کا بیٹا عدی بن حاتم اس وقت زندہ تھا وہ حضور ﷺ پر ایمان لا کر صحابی بنا۔ (ماخوذ)

☆☆☆

روھنگیا

روہنگیا میانمار (برما) کے علاقہ اراکان اور بنگلہ دیش کے علاقہ چٹاگانگ میں بسنے والے مسلمانوں کا نام ہے۔ صوبہ اراکان پر برمی تسلط کے بعد ظلم و تشدد کے دور سے تنگ آ کر بڑی تعداد میں مسلمان تھائی لینڈ میں مہاجر ہوئے۔ 28 مارچ 2008ء کو تھائی وزیر اعظم سماک سندارواج نے کہا کہ تھائی بحیرہ کوئی ویران جزیرہ ڈھونڈ رہی ہے تاکہ روہنگا مسلمانوں کو وہاں رکھا جا سکے۔

جنوب مشرقی ایشیائی ملک میانمار، جسے برما کے پُرانے نام سے بھی جانا جاتا ہے، 1937ء تک برصغیر کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر برطانیہ نے 1937ء میں اسے برصغیر سے الگ کر کے ایک علیحدہ کالونی کا درجہ دے دیا اور 1948ء تک یہ علاقہ بھی برطانوی تسلط کے زیر اثر رہا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی میانمار (برما) میں ہی جلاوطنی کے دن گزارنے پر مجبور کیا گیا اور آج بھی رنگون میں اس کی قبر مغل سلطنت کے زوال اور برطانوی سفاکیت کے نوحے سناتی نظر آتی ہے۔ میانمار کی تقریباً 5 کروڑ 60 لاکھ کی آبادی میں 89 فیصد بودھ، 4 فیصد مسلمان (تقریباً ساڑھے 22 لاکھ)، 4 فیصد عیسائی، 1 فیصد ہندو اور 2 فیصد دوسری قومیں آباد ہیں۔ یہاں پر اسلام کی آمد کے آثار 1050ء سے ملتے ہیں جب اسلام کے ابتدائی سالوں میں ہی عرب مسلمان تجارت کی غرض سے برما آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سات صوبوں کے اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت راکھین (رخائن) میں آباد ہے اور یہاں تقریباً 6 لاکھ کے قریب مسلمان بستے ہیں جنھیں ''روہنگیا'' کہا جاتا ہے۔

روہنگیا کے مسلمانوں کو عرصہ دراز سے ظلم کا سامنا ہے۔ تین نسلوں سے یہ بے چارے یہ ظلم سہہ رہے ہیں لیکن مظالم ہیں کہ جو کم ہونے کا نام نہیں لے رہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مظالم کی نئی شکلیں اور نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ تازہ ترین شکل اس کی یہ ہے کہ ہزاروں روہنگیا مسلمان مہاجرین کو تھائی لینڈ کی حکومت نے کشتیوں میں ڈال کر سمندر میں پھینک دیا ہے اور کئی دنوں سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ان انسانوں کی مدد کے لیے کوئی نہیں آ رہا۔ مسلمان ہونے کے جرم میں انھیں جس سمندر میں پھینک کر قیدی بنا دیا گیا ہے، اس کے کنارے پر دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک انڈونیشیا بھی واقع ہے اور ترقی پذیر مسلم دُنیا کا سرخیل ملائشیا بھی۔ نہ امریکا ان کے حق میں آواز بلند کر رہا ہے اور نہ چین میدان میں آ رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں شاید یہ دُنیا کی واحد نسل ہے کہ جس کے افراد کو شہریت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ انھیں پاسپورٹ جاری کیا جاتا ہے اور نہ سفر کی اجازت دی جاتی ہے۔ ہفتہ میں ایک دن ان سے جبری مشقت لی جاتی ہے جب کہ ان کی زمینوں پر فوج کے تعاون سے مقامی بدھسٹ نے قبضہ کر لیا ہے۔ برما کی حکومت کی آمریت کے جواب میں جمہوریت کے حق میں جدوجہد کی بنیاد پر وہاں کی خاتون سیاسی رہنما آنگ سان سوچی کو امن کے نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا ہے لیکن افسوس کہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر وہ اپنے ہم وطن روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے اس ظلم پر خاموش ہے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 2015ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 2015ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جولائی کا موضوع ''فیروز سنز بک شاپ'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 جولائی 2015ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔
Crayon

میری زندگی کے مقاصد
عائشہ عظیم، ایبٹ آباد
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔
مصدق رخان، کراچی
میں حافظِ قرآن بنوں گا۔
محمد ایاز، کراچی
میں ائرفورس جوائن کر کے ملک کی حفاظت کروں گا۔
علی غفار، رحیم یار خان
میں پڑھ لکھ کر ملک کا نام روشن کروں گا۔
عیان سرفراز، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔
ریبا فاطمہ، سیال کوٹ
میں شیف بن کر مزے مزے کے کھانے بناؤں گی۔
محمد حاشر، لاہور
میں حافظِ قرآن بنوں گا اور عالمِ دین بن کر دین و دُنیا کی خدمت کروں گا۔
شرجیل سرفراز، لاہور
میں کھلاڑی بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔
ماجد اقبال، کراچی
میں حافظِ قرآن بنوں گا اور سائنس دان بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔
حمزہ یاسر، لاہور
میں تعلیم حاصل کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
محمد حمزہ قادری، حیدرآباد
میں انجینئر بنوں گا اور بڑی بڑی مضبوط عمارتیں بنواؤں گا۔
سبحان ندیم، لاہور
میں ائرفورس میں پائلٹ بنوں گا اور وطن دشمن کو شکست دوں گا۔
عماد منیر احمد، لاہور
میں پائلٹ بن کر ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔
اقصیٰ شہزادی، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔
حسیب جاوید، کراچی
میں سائنس دان بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔
محمد عیسیٰ خان، ڈیرہ غازی خان
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
محمد ہارون، واہ کینٹ
میں فوجی افسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔
حسنین خالد، کراچی
میں خدمتِ خلق کروں گا۔
ولید حیات، نوشہرہ
میں سافٹ ویئر انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

ویٹ لفٹنگ

ایک دوسرے پر اپنی طاقت کی برتری کے اظہار کی خواہش انسان میں شروع ہی سے موجود ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں تاریخی حوالوں میں بھی ملتا ہے۔ خود کو دوسروں پر بلحاظ قوت افضل ثابت کرنے سے انسان کو ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس برتری کو باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ اس قسم کے اظہار کے لیے انسان نے مختلف ذرائع اپنائے، ان میں سے ایک ذریعہ بھاری وزن اُٹھانا بھی ہے۔ اس عمل کا نام دورِ جدید میں ویٹ لفٹنگ رکھا گیا اور اس سے متعلق ساز و سامان میں بھی جدت پیدا کی گئی۔ پچھلوں وقتوں میں ویٹ لفٹنگ کی شکل وہ نہیں تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ویٹ لفٹنگ کا شمار قدیم ترین کھیلوں میں ہوتا ہے کیوں کہ اپنی قوتِ آزمائش بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ ہی ایک چیلنج کی سی رہی ہے اور اس حیثیت کا تعلق کسی خاص دور یا تہذیب تک محدود نہیں۔ انسانی قوت اور اس کے مظاہرے کے لیے انسان کی مہم جوئی کے قصے ہر دور میں زبان زدِ خاص و عام رہے ہیں۔ بہرحال ماضی کے قصے کہانیوں میں متذکرہ انسانی قوت نے آج کے جدید کھیلوں میں داخل ہونے تک ایسی مسافت طے کی ہے جو صدیوں کو محیط ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مضبوط اور طاقت ور جسم کے لوگوں کے مابین مقابلے ہمیشہ ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے لیے آج جیسا جدید ساز و سامان تو موجود نہ تھا، تاہم قدرتی ذرائع یہ مقصد پورا کر دیتے تھے۔ مقابلوں میں حصہ لینے والے بھاری پتھر، درختوں کے موٹے تنے، بھاری بھرکم جانور اور شراب کے پیپے اُٹھا کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

ویٹ لفٹنگ کے پُرانے اولمپک مقابلوں کو دوبارہ بین الاقوامی سطح پر لانے کا خواب سب سے پہلے بیرن پیپرے ڈی کاؤ برٹن نے دیکھا جو 1896ء میں پورا ہوا اور ویٹ لفٹنگ کو اولمپک کھیلوں میں مستقل طور پر شامل کر لیا گیا۔ اس کھیل کی بین الاقوامی نگران تنظیم کا نام انٹرنیشنل ویٹ لفٹنگ فیڈریشن ہے اور مختلف ممالک کے تقریباً ایک سو قومی تنظیمیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انٹرنیشنل ویٹ لفٹنگ فیڈریشن (IWF) کا قیام 1920ء میں عمل میں آیا تھا۔

عرصۂ دراز تک بین الاقوامی مقابلوں میں تین لفٹس کا رواج رہا۔ (1) یعنی کلین اینڈ پریس (2) سنیچ (3) کلین اینڈ جرک۔ لیکن 1972ء میں غیر معمولی مشکلات کی وجہ سے کلین اینڈ پریس کو منسوخ کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کو اس کھیل میں اوّلیت حاصل تھی۔ 1946ء سے امریکا، روس اور مصر نے اس کھیل میں اپنا لوہا منوایا۔ اولمپک اور کامن ویلتھ کھیلوں میں ایک ملک کے زیادہ سے زیادہ نو کھلاڑی شامل ہو سکتے ہیں۔ مقابلے کا فیصلہ کسی کھلاڑی کی تین میں سے دو بہترین لفٹوں میں اُٹھائے گئے مجموعی وزن پر ہوتا ہے۔ سنیچ میں کھلاڑی آمنے سامنے رکھی ہوئی بار کو ایک ہی کوشش میں سر کے اُوپر لے جاتا ہے۔ کلین اینڈ جرک میں کھلاڑی پہلے بار کو شانوں تک لاتا ہے اور اس کے بعد بار میں بنیادی اور معاون حرکت پیدا کرنے کے لیے گھٹنوں کو خم دیتے ہوئے اسے بلند کرتا ہے۔

ہر کھلاڑی لفٹر کو ہر لفٹ کے تین تین مواقع دیے جاتے ہیں۔ مقابلے کی نگرانی تین ریفری کرتے ہیں اور مقابلے کا نتیجہ دو کی رائے سے ہوتا ہے۔ اگر لفٹ ناکام یا خلاف ضابطہ ہو تو ریفری سرخ جھنڈی یا سرخ روشنی سے اور اگر لفٹ کام یاب یا ضابطے کے مطابق ہو تو سفید جھنڈی یا سفید روشنی سے اشارہ کرتا ہے۔ اس ورزش کے لیے چستی کی نسبت قوت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ☆☆☆

1- پھولا پھولا اس کا پیٹ
اور رہے بستر پر لیٹ

لائبہ عرفان، کراچی

2- ایک درخت کی پانچ ٹہنیاں
دو پر دھوپ تین پر چھاؤں

3- ایک ڈبے میں بتیس دانے
بوجھنے والے بڑے سیانے

4- ایک سینگ کی ایسی گائے
جتنا دو اتنی ہی کھائے
کھاتے کھاتے گانا گائے
پیٹ نہیں اس کا بھر پائے

سید محمد موسیٰ

5- لال گائے کبھی نہ نہائے
اگر نہائے تو مر جائے

6- اوپر یا وہ نیچے جائے
قدم قدم پر جوتے کھائے

7- سر پر ڈال کر پکتا ہے پانی
رنگ دکھاتی ہے یہ مستانی
پہلے تو گھر میں چھپ جائے
پھر پردے سے یہ باہر آئے

8- موتی سچے تھے یا جھوٹے
ہاتھ کے لگتے ہی سب ٹوٹے

9- ہاتھ میں آ کر چلتا ہے
نیچے رکھو رکتا ہے
جتنا چاہو اسے چلاؤ
چلنے سے نہیں یہ تھکتا ہے

تلاش کرو

الف سے ض تک تمام تکونوں میں دیئے ہوئے ہندسوں میں سے ایک ایک ہندسہ اس طرح لکھئے کہ جس طرف سے بھی چار تکونوں کے ہندسوں کو جوڑیں، مجموعہ 48 ہو۔ ایک ہندسہ ایک ہی بار لکھئے۔

8
9 · 10
11 · 12
13 · 14
15 · 16

ا
ب ض
ج ص
د ر س ش
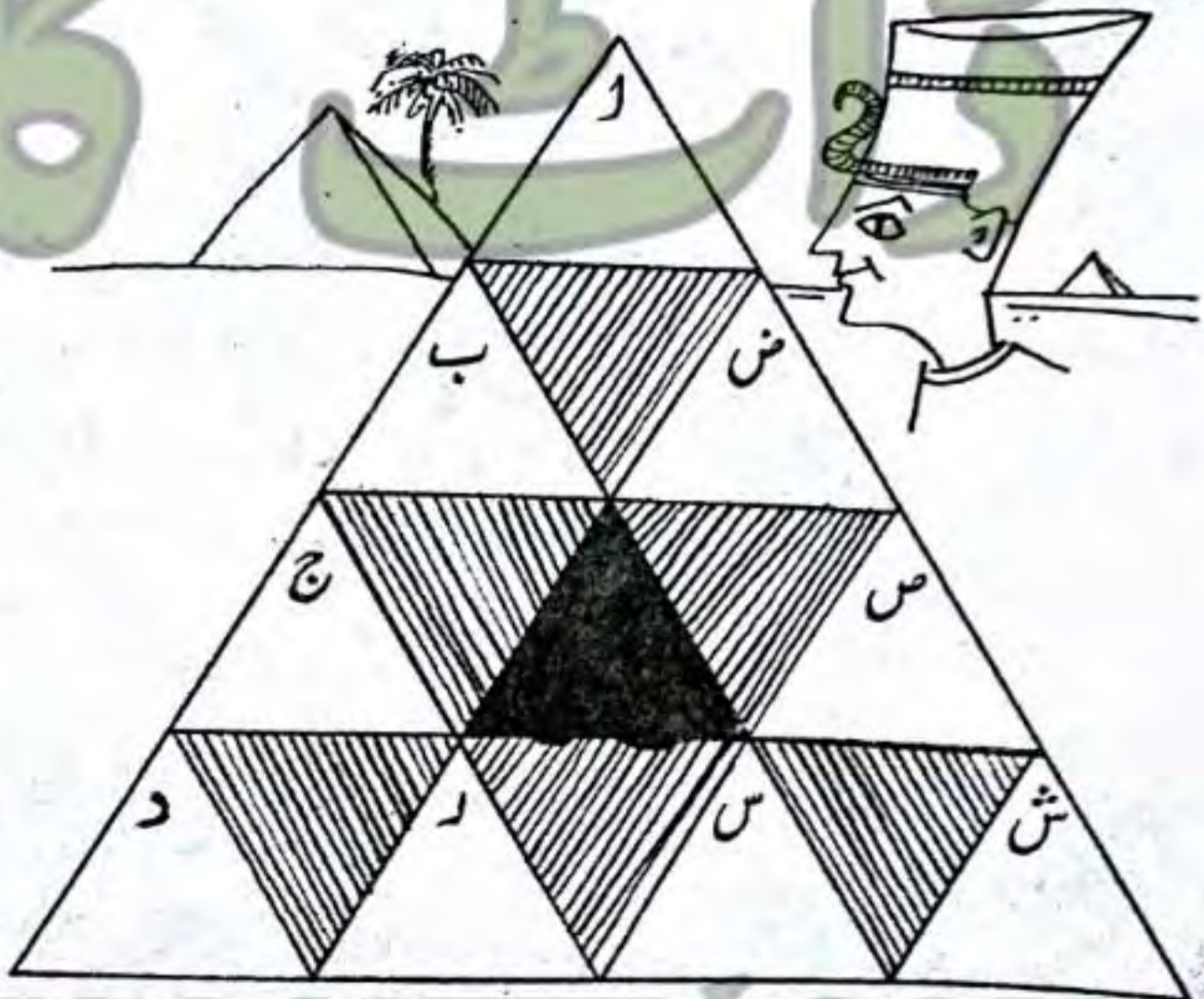
عید الفطر

عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی
عید آئی ، ہم سب کی خاطر کتنی خوشیاں لائی!
ناچ اُٹھا دِل شوق میں آ کر ، روح پہ مستی چھائی
چہرے پر سرخی دوڑی ، ہونٹوں پر آئی لالی
عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی!

عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی
میٹھی میٹھی ، لمبی لمبی ، سب کے دِل کو بھائیں
کیسے اپنے آپ کو گلے سے نیچے اُترتی جائیں
امی جان! مجھے بھی دے دو بھر کر اور اِک تھالی
عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی!

عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی
چمن چمن میں رونق آئی ، بوٹا بوٹا مہکا،
مور ، کبوتر ، تیتر ، قمری ، کوئل ، بلبل چہکا
پتا پتا جھوم اُٹھا ، لہرائی ڈالی ڈالی
عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی!

عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی
آؤ ہم تم سارے مل کر اُچھلیں کودیں گائیں
سب یاروں کو ساتھ ملا کر ہم بھی عید منائیں
خوشیوں کا ایک کھیل رچائیں اور بجائیں تالی
عید سویوں والی آئی ، عید سویوں والی!

آڑو

آڑو (Peach) کا سائنسی نام "Prunus Persica" ہے۔ اس کا تعلق "Roseaceae" یعنی گلاب کے خاندان سے ہے۔ یہ سدا بہار چھوٹے سائز کا درخت ہے۔ اس کا آبائی تعلق شمال مغربی چین سے ہے۔ درخت کی اونچائی 13 سے 33 فٹ ہو سکتی ہے۔ پتے لمبوترے ہوتے ہیں جن کا سائز لمبائی میں 7 سے 16

سینٹی میٹر (2.8 سے 6.3 انچ) اور چوڑائی 2 سے 3 سینٹی میٹر (0.79 سے 1.18 انچ) ہوتی ہے۔ پانچ پتیوں (Petals) والے گلابی رنگت کے پھول کا قطر 2.5 سے 3 سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ پھل کی گٹھلی 1.3 سے 2 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس پھل کو "Stone Fruite" بھی کہتے ہیں۔ آڑو کی درجنوں انواع دریافت ہو چکی ہیں۔ آڑو کی پیداوار کے لحاظ سے چین، اٹلی، اسپین، امریکہ، یونان، ترکی اور ایران نمایاں ممالک ہیں۔ اس کے پھل میں کاربوہائیڈریٹس، چکنائیاں اور پروٹینز کے علاوہ وٹامن A وٹامن B، رائبوفلیون، نیاسن، فولیٹ، وٹامن C، وٹامن E اور وٹامن K پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آڑو کیلشیم، آئرن، میگنشیم، مینگنیز، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم، زنک اور فلورائیڈز کا بھی خزانہ ہے۔ آنتوں کے افعال کو بہتر بناتا ہے اور پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرنے میں بھی آڑو لاجواب ہے۔ آڑو کے چھلکے میں 110 مختلف کیمیائی اجزا خوشبو پیدا کرتے ہیں۔

مالدیپ

مالدیپ (Maldives) یا جمہوریہ مالدیپ ایک اسلامی ملک ہے جو جزائر پر مشتمل ایک ریاست ہے جس کے جنوب میں

بھارت اور 700 کلو میٹر جنوب مغرب میں سری لنکا واقع ہے۔ اس ملک میں 1192 جزائر ہیں جن میں سے 200 کے لگ بھگ جزائر پر انسانی آبادی موجود ہے۔ مالدیپ کا دارالحکومت مالے (Male) ہے۔ ملک کی سرکاری زبان "Maldivians" ہے۔ یہاں صدارتی نظام حکومت رائج ہے۔ سطح زمین پر یہ سب سے نچلا ملک ہے جس کا سمندر میں غرق ہونے کا امکان موجود ہے۔ اگر آلودگی نہ رُکی تو شاید یہ ریاست دُنیا کے نقشہ پر نہ رہے۔ 12 ویں

صدی تک بدھ مت یہاں کا بڑا مذہب تھا۔ 1153ء میں یہاں اسلام کی روشنی پہنچی۔ 26 جولائی 1965ء کو اس ملک نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ ملک کا کل رقبہ 298 مربع کلو میٹر ہے۔

بس

دُنیا بھر میں لوگوں کو سفری سہولت مہیا کرنے میں بس (Bus) بڑی اہم ہے۔ دُنیا کی سب سے بڑی بس چین کے پاس ہے جس کا نام "Young Man JNP 6250G" ہے۔ اس بس میں ایک وقت میں 300 مسافر سفر کرتے ہیں۔ اس میگا بس کی لمبائی عام بس سے 13 میٹر زیادہ ہے۔ یہ بس چین کے دارالحکومت بیجنگ سے "Hangzohu" شہر کے درمیان چلتی ہے۔ حکومت نے اس سروس کے تحت متعدد بسیں چلانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ گنجان آبادی کو سفری سہولیات میسر آسکیں۔ اس بس کی لمبائی 82 فٹ ہے جو عام بس کی طرح مڑسکتی ہے۔ البتہ یہ 50 میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتی ہے۔ مسافروں کے سوار ہونے کے لیے 5 دروازے ہیں۔ اندر ایسی نشستیں نصب ہیں جنھیں پھیلایا بھی جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جرمنی کی بس ہے جو لمبائی میں 101 فٹ

ہے اور اس میں 256 مسافر سفر کر سکتے ہیں۔ دُنیا کی ابتدائی بس فرانس کے شہر پیرس میں 1662ء کو متعارف ہوئی۔ اس بس نما گاڑی کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ 1833ء میں بھاپ سے چلنے والی بس نے لندن میں دھوم مچائی۔

گریگر جان مینڈل

گریگر جان مینڈل (Gregor Johann Mendel) کو علم جینٹکس (Genetics) کا باپ کہا جاتا ہے۔ آپ 20 جولائی 1822ء کو آسٹریا کے گاؤں "Moravia" میں ایک

کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام "Rosine" اور والدہ کا نام "Anton" بہن کا نام "Veronika" اور دوسری بہن کا نام "Theresia" تھا۔ مینڈل نے ریاضی اور شماریات کے علم میں ڈگری حاصل کی اور پیشہ کے اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ایک چرچ کے پادری بن گئے۔ مینڈل نے ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم کے دوران حیاتیات (Biology) کی تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ چنانچہ مینڈل نے مٹر "Pisum Sativum" کے پودے پر تحقیقات کا آغاز کیا اور قوانینِ وراثت مرتب کیے جنھیں آج پوری دُنیا میں پڑھایا جاتا ہے۔ 6 جنوری 1884ء کو 61 برس کی عمر میں مینڈل کا انتقال ہوگیا۔ مینڈل کی وفات گردے کی بیماری کی وجہ سے ہوئی۔ مینڈل کی زندگی میں اس کے کام کو پذیرائی حاصل نہ ہوسکی، البتہ اس کی وفات کے 16 سال بعد دُنیا نے اعتراف کیا کہ مینڈل کے وضع کردہ قوانین درست ہیں۔ مینڈل نے فزکس اور فلسفہ بھی پڑھ رکھا تھا۔ ☆☆

دیکھا جو تیر کھا کہ کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی
(ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

شام سورج کو ڈھلنا سکھا دیتی ہے
شمع پروانے کو جلنا سکھا دیتی ہے
گرنے والے کو تکلیف تو ہوتی ہے مگر
ٹھوکر انسان کو چلنا سکھا دیتی ہے
(صبا شوکت، گوجرانوالہ)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

☆

نہیں ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو، یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
(محمد حسن ندیم، اٹک)

الفاظ تلخ ! بات کا انداز سرد ہے
پچھلا ملال آج بھی گویا نہیں گیا
اب بھی کہیں کہیں پہ ہے کالک لگی ہوئی
رنجش کا داغ ٹھیک سے دھویا نہیں گیا
(حافظ محمد آصف لطیف، گوجرانوالہ)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہے

☆

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
(مشیرہ سلیمان بٹ)

سجدۂ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے
خالی مسجدوں میں تو دُنیا ہی بسا کرتی ہے

☆

ہم نے سوچتے سوچتے وقت گنوا دیا روؔمی
وہ جو اہلِ قلم تھے عنوانِ زندگی لکھ گئے
(افراح اکبر، لاہور)

گندم امیرِ شہر کی ہوتی رہی خراب
بیٹی کسی غریب کی فاقوں سے مر گئی
(مدیحہ ادریس مغل، قلعہ دیدار سنگھ)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(ثروت یعقوب، لاہور)

وہ حیراں ہیں تمہارے ضبط پہ، کہہ دو قتیؔل ان سے
جو دامن پہ نہیں گرتا، وہ آنسو دل پہ گرتا ہے
(ابرار الحق، راجہ جنگ)

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے
(فاطمہ ضیاء، گجرات)

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
(محمد عثمان علی، بھکر)

دیکھتے دیکھتے ویراں ہوئے منظر کتنے
اُڑ گئے بامِ تمنا سے کبوتر کتنے
(محمد حارث سعید، بورے والا)

آدم کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر
(شیرونیہ ثناء، حیدر آباد)

مینگو چیز کیک

اجزاء:

چینی:	دو سو گرام	آم کا رس:	سات سو گرام	جیلاٹن پاؤڈر:	پچاس گرام
کریم:	دو سو پچاس گرام	کریم چیز:	دو سو پچاس گرام	آم:	چار عدد بڑے والے
لیموں:	ایک عدد	نمک:	آدھا چائے کا چمچ	انڈے کی زردی:	حسبِ ضرورت

ترکیب:

ایک چھوٹے برتن میں جیلاٹن اور ایک کھانے کا چمچ پانی کے ساتھ ملا کر آمیزہ بنالیں۔ آم کے قتلے کاٹ کر مولڈ میں پھیلا کر فریزر میں تقریباً پندرہ منٹ کے لیے ٹھنڈا کرلیں۔ سوس پین میں چینی، نمک، انڈے کی زردی، لیموں اور آم کا رس ڈال کر درمیانی آنچ پر پکالیں۔ پہلا اُبال آنے پر چولہے سے اُتار لیں۔ اس میں جیلاٹن شامل کرکے ٹھنڈا ہونے دیں۔ پنیر کے ساتھ کریم ملا کر ہلکے ہاتھ سے پھینٹ لیں اور مولڈ میں رکھے ہوئے آموں پر ڈال دیں۔ تقریباً دو گھنٹے فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ مزیدار مینگو چیز کیک تیار ہے۔

اٹالین سیلڈ

اجزاء:

میکرونی:	دو کپ (اُبلی ہوئی)	شملہ مرچیں:	دو عدد (بیج نکال کر کیوبز کاٹ لیں)	ہری پیاز:	دو عدد (چوپ کرلیں)
گاجریں:	دو عدد (چوپ کرلیں)	انڈے:	دو سے تین عدد (اُبلے ہوئے)	کریم:	دو عدد کھانے کے چمچ
لیموں کا رس:	ایک چائے کا چمچ	مایونیز:	پانچ کھانے کے چمچ	زیتون کا تیل:	ایک چائے کا چمچ
بند گوبھی:	ایک کپ (کدوکش کی ہوئی)	پاپڑ:	حسبِ پسند (سرونگ کے لیے)	نمک، سفید مرچ پاؤڈر:	حسب ذائقہ

ترکیب:

ایک پیالے میں میکرونی، شملہ مرچیں، ہری پیاز، گاجریں اور بند گوبھی ڈال کر مکس کرلیں۔ ڈریسنگ تیار کرنے کے لیے ایک دوسرے پیالے میں کریم، لیموں کا رس، مایونیز، زیتون کا تیل، نمک، سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کرلیں۔ اب تیار کی ہوئی ڈریسنگ کو سبزیوں اور میکرونی والے پیالے میں ڈال کر ٹوڑ کریں۔ مزیدار اٹالین سیلڈ تیار ہے۔ سیلڈ باؤل میں نکال کر اُبلے ہوئے انڈے سے گارنش کرکے پاپڑ کے ساتھ سرو کریں۔

"یہ زندگی ہے اس میں محبتیں بھی ہیں اور نفرتیں بھی ہیں۔ محبت انسان کو سنوارتی ہے اور نفرت انسان کو بگاڑتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو نفرت سنوار دے۔ خلیل الرحمٰن ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ وہی جو ابھی ہمیں نماز پڑھنے کا اشارہ کر کے گیا ہے۔" یہ اعظم تھا جو دل کی گہرائیوں سے بات کر رہا تھا۔ اعظم کو میں اپنا دوست نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، اس سے سلام دعا کا تعلق ضرور تھا۔ ہماری دُکانیں ایک ہی بازار میں تھیں۔ اس لیے ملنا ملانا رہتا تھا۔ میں اپنی دُکان کی طرف جاتے ہوئے اعظم کے پاس رُک گیا تھا۔ پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ پچھلے دنوں اعظم کی دُکان میں آگ لگ گئی تھی، وہ کپڑے کا کام کرتا تھا۔ دُکان میں پڑا سارا سامان جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ اب اعظم نے ایک نئے سرے سے کام کی ابتداء کی تھی۔ میں اس کی دل جوئی کے لیے آیا تھا۔ میں خلیل کو بھی جانتا تھا، بازار میں اس کی بھی کپڑے کی دُکان تھی۔ وہ اعظم اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گیا تھا۔ پھر اس نے کانوں کو یوں ہاتھ لگایا جیسے نماز کی نیت باندھ رہا ہو۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آؤ مسجد میں چلتے ہیں۔ وہ چلا گیا تو اعظم نے دوبارہ بات شروع کی۔

"اس نفرت کو آپ کاروباری رقابت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بازار میں خلیل کی واحد دُکان تھی جہاں کپڑے کی خرید وفروخت کا کام ہوتا تھا۔ پھر میں نے کام کا آغاز کیا تو کپڑے کے گاہک تقسیم ہو گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دُکان داری اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کام چل نکلا تو خلیل مجھ سے جلنے لگا۔ جلن کی اس آگ سے نفرت پیدا ہوئی۔ اب تو وہ میرا دل دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تھوک پھینکنا...... لوگوں کو میرے خلاف بدگمان کرنا۔ اگر کوئی میری تلاش میں اس کی دُکان پر چلا گیا تو اسے غلط سمت میں روانہ کر دیتا۔ ایسے اور بھی بہت سے ردعمل تھے اور مجھے سب خبر تھی۔ ایسے میں ایک واقعہ ہوگیا۔" میں پوری دل چسپی سے سن رہا تھا لیکن اعظم نے بات اُدھوری چھوڑ دی تھی۔ میری سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا۔

"پہلے نماز پڑھ لیں......" یہ دعوت ایسی تھی جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ساتھ ہی مسجد تھی۔ ہم مسجد میں چلے آئے۔ خلیل پہلے سے موجود تھا۔ ہم تینوں نے کندھے سے کندھا ملا کر نماز ادا کی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی کیوں کہ میں وہ بات جانتا تھا جو وہ دونوں نہیں جانتے تھے۔ ہاں، ان دونوں کو ایک ساتھ نماز ادا کرتے دیکھ کر مجھے بہت سکون ملا تھا۔

"ہاں تو وہ واقعہ کیا تھا......" نماز کی ادائیگی کے بعد میں دوبارہ اعظم کی دُکان پر آ بیٹھا تھا۔

"واقعہ بہت عجیب سا تھا شاید اس واقعے نے خلیل کے دل کی دُنیا بدل دی تھی۔ ان دنوں خلیل کی نفرت عروج پر تھی۔ عصر کی نماز کا

وقت تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد تمام نمازی مسجد میں سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا خلیل مسجد کے بیت الخلاء میں سے باہر نکل رہا تھا۔ ان دنوں وہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ وہ بھی نمازیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ہم ایک ساتھ مسجد کے بیرونی دروازے میں سے باہر نکلے۔ باہر ایک خاتون کھڑی تھی۔ اس نے اپنی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ اُٹھا رکھا تھا اور وہ نماز پڑھ کر آگے والوں کے چہرے تاڑ رہی تھی۔ پھر خلیل کے چہرے میں اسے نجانے کیا بات نظر آئی، اس نے خلیل کو روک لیا۔

''میرے بچے کی طبیعت خراب ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے دوالی ہے۔ شاید میرے بچے کو نظرِبد کی شکایت ہے۔ آپ دم کر دیجیے.....'' شرمندگی کے احساس سے خلیل کا سر جھک گیا۔ اس کا وضو نہیں تھا۔ وہ بیت الخلاء سے آیا تھا۔ اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ اللہ کا پاک کلام وہ پڑھتا تو کیسے پڑھتا۔

''میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ وضو نہ ہو تب بھی قرآنی آیات کی زبان سے تلاوت جائز ہے۔ اب میں آگے بڑھا۔ میں نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تلاوت کی، بچے کی صحت کے لیے دعا مانگی اور بچے کو دم کر دیا۔ یہ سارا منظر خلیل دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ کم سے کم اس نے اللہ کی بارگاہ میں جھکنے کے لیے قدم تو اُٹھایا۔ یہ نماز کی طاقت ہے۔ اس کی طرف پہلا قدم اُٹھانا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پہلا قدم اُٹھ گیا تو آگے کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔'' اعظم رُکا تو بولا۔

''یہ بات تو سمجھ میں آئی کہ خلیل کے دل کی دُنیا کیسے بدلی۔ ہاں، تم سے وہ جو نفرت کرتا تھا اس کا خاتمہ کیسے ہوا۔'' ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ نماز دل میں نرمی پیدا کرتی ہے۔ دل کا میلاپن دھو دیتی ہے۔ شاید یہ اسی کا کرشمہ ہو۔ اب دیکھ لو میری دُکان جل گئی تو سب سے پہلے جس انسان نے میری مدد کی، وہ خلیل ہی ہے۔ خلیل کی وجہ سے ہی میں بازار میں دوبارہ قدم جما سکا۔'' اعظم خلیل کے احسان کا برملا اظہار کر رہا تھا۔ یہ خوبی بھی اعظم جیسے انسان میں ہی ہو سکتی تھی۔ میں دل پر بوجھ لیے واپس لوٹ آیا۔ رات کو میں اپنے گھر پہنچا تو میری طبیعت خراب تھی۔ کچھ بے سکونی کی سی کیفیت تھی۔ میں بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے خلیل کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب خلیل، اعظم کا دوست ہے لیکن اعظم نہیں جانتا تھا کہ خلیل میرا دوست ہے اور میرا پڑوسی بھی ہے۔

''میں تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب تھا لیکن پھر سوچا کہ تم رات کا کھانا کھا لو۔ تھوڑا آرام کر لو، پھر ملاقات کے لیے آؤں گا۔'' خلیل کی حرکات وسکنات سے اس کی بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

''میری تو بھوک ہی مر گئی ہے۔ میں بھی تم سے ملنا چاہتا تھا اور تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ تم نے ظلم کیا لیکن نہیں ظلم چھوٹا لفظ ہے، تم نے گناہ کیا۔ تم نے ایک ایسے آدمی کو تکلیف دینے کی کوشش کی جو اپنے دل میں اللہ کی پاک ذات کو بسائے بیٹھا ہے۔ تم اسے کیا برباد کرو گے، اسے برباد کرنے کی کوشش میں تم خود برباد ہو جاؤ گے۔''

میں نے اپنا سارا غصہ خلیل پر اُگل دیا تھا اور پھر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ سر جھکائے گھر میں داخل ہو گیا۔

''میں جانتا ہوں مجھ سے گناہ ہوا ہے اور میں مداوا کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ بس تم یہ بتاؤ اعظم کا دل تو میری طرف سے صاف ہے نا......'' خلیل نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں، اس نے تو مجھے یہاں تک بتایا ہے کہ دُکان جلنے کے بعد خلیل ہی وہ واحد آدمی تھا جس نے میری مدد کی لیکن وہ بے چارہ نہیں جانتا کہ اس کی دُکان میں آگ لگانے والے بھی تم ہی تھے۔'' میرا لہجہ بہت زہریلا تھا، میں جانتا تھا خلیل کو نفرت نے شیطان بنا دیا تھا۔ اپنے شیطانی جذبات کی تسکین کے لیے اس نے اعظم کی دُکان میں آگ لگوا دی تھی۔ میں یہ بات کبھی نہ جان پاتا لیکن ایک قانون ہے زمین کا حساب زمین پر ہی ہوتا ہے۔ کسی کے لیے گڑھا کھودنے والا خود اسی گڑھے میں جا گرتا ہے۔ جس رات اعظم کی دُکان میں آگ لگائی گئی تھی، خلیل بہت مسرور تھا کہ اب میں نے انتقام لے لیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا کہ اچانک اس کی بیوی زور زور سے چیخنے لگی۔ چیخ پکار سن کر میں نے دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ خلیل بھی کمرے میں سے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں نے دیکھا خلیل کی بیوی بہت خوف زدہ تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور صحن میں اس کی چادر جل رہی تھی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟'' خلیل نے اپنی بیوی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''وہ میں...... میں باورچی خانے میں تھی۔ کھانا تیار کر رہی تھی۔ میں گھی والا برتن لینے اُٹھی تو میری چادر کے پلو نے چولہے سے آگ پکڑ لی، میں گھبرا گئی۔ میں نے چادر اُتار کر صحن میں پھینک دی۔ اگر میرے کپڑوں کو آگ لگ جاتی تو کیا ہوتا...... تو کیا ہوتا......'' یہ خلیل کی بیوی کا سوال تھا جو ہتھوڑا بن کر خلیل کے سر پر برس رہا تھا۔ ایک آگ اس نے لگائی تھی۔ ایک آگ اللہ نے لگائی تھی لیکن اللہ کی پاک ذات بہت رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو تکلیف نہیں دیتا۔ ہاں سیدھے راستے کی طرف ضرور بلاتا ہے۔

''یہ میرا ہی خراب عمل تھا جو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔'' اپنی بیوی کی چادر کو جلتا دیکھ کر خلیل مردہ آواز میں بولا۔ اس کے بعد خلیل نے مجھے اپنی نفرت کی کہانی سنائی جو آگ سے شروع ہو کر آگ پر ہی ختم ہوتی تھی۔ نفرت بھی تو ایک آگ ہی ہے جو آپ کے وجود کو جلاتی رہتی ہے۔

اب خلیل نے اس نقصان کا ازالہ کر دیا تھا لیکن وہ جاننا چاہتا تھا کہ اعظم اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے اور میں نے اسے دھمکی لگا دی تھی کہ اس کی دُکان کو آگ لگانے والے بھی تم ہو۔ اگر اعظم کو معلوم ہو جائے کہ یہ ظلم تم نے کیا ہے تو پھر کیا ہوگا۔ خلیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا تم میرے والے راستے پر چلو گے۔ میں اعظم سے نفرت کرتا تھا تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ میں نے نفرت چھوڑ کر محبت والا راستہ اپنایا ہے۔ نفرت تو میں نے گنوا دی۔ اب میں اپنا دوست گنوانا نہیں چاہتا۔'' میں نے خلیل کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ نفرت انسان کو گنواتی ہے تو محبت انسان کو سنوارتی ہے۔ میرا دوست خلیل اب سنور چکا تھا اور اس نے نفرت گنوا کر اعظم جیسا دوست پایا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ میں ان کی دوستی کے رشتے میں نفرت کا بیج بوتا۔ اس لیے میں نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میں بھی اپنے دل میں وہی سکون محسوس کر رہا تھا جو خلیل اور اعظم کے دل میں موجود تھا۔ ☆☆☆

اولڈ فیتھ فُل

امریکا کی ایک پہاڑی ریاست ''وایو مِنگ'' میں ایک بہت خوب صورت پارک ہے جسے ''یلو اِسٹون نیشنل پارک'' کہتے ہیں۔ اس پارک میں کئی قابلِ دید چیزیں ہیں لیکن سب سے مشہور چیز ایک گیزر (Geyser) یعنی گرم پانی کا چشمہ ہے جسے لوگ ''اولڈ فیتھ فُل'' کہتے ہیں۔

اس گیزر میں سے ہر 65 منٹ بعد گیس کے ساتھ پانی کی موٹی سی دھار نکلتی ہے جو آہستہ آہستہ اُونچی ہونا شروع ہوتی ہے اور دو تین منٹ بعد 150 فٹ تک بلند ہو جاتی ہے۔ پانچ منٹ بعد اس کی بلندی کم ہونے لگتی ہے اور پھر کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

گیزر اصل میں گرم پانی کے چشمے ہوتے ہیں۔ یہ ان علاقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں کبھی آتش فشاں پہاڑ ہوتے تھے۔ یہاں زمین کی سطح کے نیچے پگھلی ہوئی چٹان (میگ ما) ہوتی ہے۔ اس چٹان کی حرارت سے گیس بنتی رہتی ہے اور جب گیس کا دباؤ بڑھتا ہے تو وہ پھوٹ پڑتی ہے اور اس کے ساتھ گرم پانی کی دھار بھی نکلتی ہے۔

اس قسم کے گیزر آئس لینڈ اور نیوزی لینڈ میں بھی ہیں لیکن ان کی دھار اتنی اُونچی نہیں ہوتی اور نہ اس کے نکلنے کا کوئی وقت مقرر ہے۔ یہ خوبی یلو اِسٹون نیشنل پارک کے اس گیزر ہی میں ہے، اسی لیے لوگ اسے Old Faithful یعنی قابلِ اعتبار بوڑھا کہتے ہیں۔

(احور کامران رانا، لاہور)

دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر

الیکشن ہونے والے تھے۔ لوگ پارٹیاں بنا بنا کر اپنے اپنے پسندیدہ امیدواروں کے حق میں پروپیگنڈہ کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں محلے کے چند لوگ بابو غلام خان کے گھر بھی آئے۔ پارٹی کا ایک معتبر آدمی بولا: بابو صاحب! ہم سب محلّہ دار صوفی گلزار بخش کو ووٹ دے رہے ہیں، آپ بھی صوفی صاحب کو ووٹ دیجیے گا۔ غالباً آٹھ ووٹ ہیں آپ کے گھر کے؟ پرچیاں بنوا کر بھیج دی جائیں گی تاکہ آپ کو سہولت ہو جائے۔"

کہنے والا خود بخود ہی سب کچھ کہتا چلا گیا اور بابو غلام خان کے اقرار یا انکار کا انتظار بھی نہ کیا۔ بابو نے قدرے تامل سے کہا:

"شیخ صاحب! کیا آپ سب صوفی گلزار بخش کی پچھلی کارکردگی بھول گئے ہیں؟ سابقہ دور میں جب وہ کونسلر تھے تو سڑکوں اور گلی کوچوں میں گٹروں کا پانی ہر وقت بہتا رہتا تھا۔ لوگ شکایت لے کر جاتے تو وہ کہا کرتے تھے کہ میں بھی پائنچے اُٹھا کر گزر جاتا ہوں، آپ بھی پائنچے اوپر کر کے گزر جایا کریں۔ جب زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین ہوئے تو ضرورت مند لوگوں کو جواب ملتا کہ ابھی فنڈ بھی نہیں آئے۔ ان کی کون سی خدمت گزاری پر آپ لوگ انہیں دوبارہ ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں؟ معاف کیجیے گا، میں تو انہیں ووٹ نہیں دوں گا۔" یہ سن کر دو تین آدمی اکٹھے بول اُٹھے: "یہ تو آپ اچھا نہ کریں گے۔ آپ کو معلوم بھی ہے صوفی صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

شیخ صاحب بولے: "دیکھو نا بابو! صوفی صاحب ملک کے بڑے بڑے مگرمچھوں میں سے ایک ہے۔ ہم تم جیسے لوگوں کی حیثیت اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں جیسی ہے۔ گویا دریا میں مگرمچھ کے ساتھ رہتے ہوئے اس سے دشمنی رکھنا اپنے لیے ہی خطرہ ہے۔" انھوں نے بابو کو دھیرے سے سمجھانے کی کوشش کی مگر بابو نفی میں سر ہلا کر بولا: "نہ شیخ صاحب! محض خطرے کے ڈر سے اصول کو نظرانداز کر دینا انسانیت نہیں، ہمیں غلط لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے نہ کہ ڈر کر ان کا ساتھ دینا؟"

شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بابو کو بہت سمجھایا بلکہ ڈرایا دھمکایا مگر اس کا انکار اقرار میں نہ بدلا تو وہ لوگ مایوس ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے شیخ صاحب نے ایک بار پھر کہا:

"میں تو آپ کو یہی نصیحت کروں گا بابو صاحب کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا ٹھیک نہیں۔"

☆☆☆

کھڑکھاند گروپ اور افطار پارٹی

فتح محمد عرشی

ملنگی نے کوئی چوتھی بار کارڈ کو بہ آوازِ بلند پڑا تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''جناب راشد صاحب ایک شاندار افطار پارٹی کا اہتمام کر رہے ہیں، جس میں تمام کھڑکھاند گروپ کی شرکت ہمارے لیے باعثِ اجر وثواب اور صد افتخار ہو گی۔'' گنجے والا نے اطلاع دی۔

''واہ جی واہ...... کیا مزے کی پارٹی ہوگی۔'' چھوٹے والا نے چٹخارہ لیا۔ ''ارے، راشد صاحب وہی ہیں ناں؟ ایم این اے...... کیا غضب کے کھانے ہوں گے۔ بریانی، قورمہ، مرغ مسلّم، کھیر اور ہر قسم کے پھل...... اور...... اور......''

''اور سب کچھ ہو گا یار!'' دادا بڈی نے گویا اسے تسلی دی۔ ''بڑے لوگوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔''

''اور وہاں فوٹو گرافر بھی تو ہوں گے۔'' مبارکاں نے بھی چہک کر کہا۔ ''اخباروں میں ہماری رنگین تصویریں آئیں گی۔ جل جائیں گے جلنے والے۔''

''بس بس، زیادہ پھیلو مت۔'' گنجے والا نے انہیں ڈانٹا۔ ''گرمیوں کے روزوں سے میری تو جان جاتی ہے۔ میں تو گھر والوں سے کہہ دیتا ہوں کہ......

اے میری بیوی میرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے میرے بچو، ذرا ہوشیار! میں روزے سے ہوں''

دوستو! کھڑکھاند گروپ کے روزے کا حال جاننے کے لیے مرزا غالبؔ کے خط کا ایک اقتباس بہت مفید ثابت ہوگا۔

مرزا غالبؔ مرحوم اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ ''بھائی! رمضان آتا ہے تو روزہ رکھ لیتے ہیں اور پھر طرح طرح سے روزے کو بہلاتے رہتے ہیں۔ کبھی آم کھا لیا، تو کبھی دودھ پی لیا۔ کبھی پھلوں سے دل بہلایا تو کبھی روٹی سے روزے کی مہمان نوازی کی...... مگر یہاں کے لوگ بھی عجیب ہیں۔ کہتے ہیں، غالبؔ روزہ نہیں رکھتا حالاں کہ روزہ نہ رکھنا اور بات ہے، روزے کو بہلانا اور بات ہے۔''

تو جناب...... کچھ کھڑکھاندی بھی اسی طرح روزے کو بہلاتے رہتے ہیں لیکن یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ روزے نہیں رکھتے مگر بقول گنجے والا: ''کوئی کسی کی زبان تو نہیں پکڑ سکتا ناں!''

مگر اب تو ہر حال میں روزہ رکھنا تھا۔ آخر افطاری کی دعوت جو تھی!

چھوٹے والا کا قصہ تو عجیب ہے۔ روزہ کیا رکھا، سب گھر والوں کی جان پر بن آئی۔ کمرے میں بند پڑے ہیں اور ہر آدھے گھنٹے بعد پوچھتے ہیں۔ سورج غروب ہوا یا نہیں؟ اللہ اللہ کر کے ظہر کا وقت ہوا تو کہنے لگے۔ ''روٹی لے آؤ...... سورج جو ضد پر اُتر آیا

ہے کہ آج غروب نہیں ہونا تو ہم ضد چھوڑ دیں۔“

گنجے والا کا حال اس سے بھی بُرا تھا۔ اب تک پانچ بار نہا چکا تھا۔ آخری بار جب غسل خانے میں گیا تو اتنی دیر لگائی کہ گھر والوں کو لگا جیسے سیدھا جنت کو سدھار گئے ہیں۔ انہوں نے باہر سے آوازیں دیں۔ بڑی مشکل سے جب اندر سے گنجے والا کی آواز سنائی دی تو ان کی تشویش کچھ کم ہوئی۔ اگرچہ آواز اب بھی کسی قریب المرگ ہستی کی لگتی تھی۔

خیر، جب افطاری کے لیے روانہ ہونے لگے تو مبارکاں غائب تھا۔ وہ سب اس کے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ بیٹھک میں ہیں۔ وہاں جا کر عجیب ہی حال نظر آیا۔ مبارکاں ایک پلنگ پر مریضِ لادوا کی طرح پڑا ہوا ہے اور دیوار پر چاروں طرف گھڑیاں ہی گھڑیاں لگی ہیں۔ کچھ ڈیجیٹل اور کچھ سوئیوں والی، حتیٰ کہ ایک گھڑیال بھی ٹنگا ہوا تھا جس کا پینڈولم ملنگی کی طرح جھول رہا تھا۔

سارے کھڑکھاندی یہ حال دیکھ کر حیران رہ گئے اور پوچھا۔ ”یہ گھڑیوں والا گورکھ دھندا سمجھ میں نہیں آیا۔“

”ارے یہ......“ مبارکاں نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”روزہ بہلا رہا ہوں۔ جس دن روزہ رکھ لیتا ہوں، اسی طرح بہلاتا رہتا ہوں۔“

عصر کا وقت تھا جب کھڑکھاند گروپ افطاری کے لیے پیدل روانہ ہوا۔ اگرچہ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی رکشہ کرایہ پر لے لیں لیکن گنجے والا کا اصرار تھا کہ پیدل ہی جائیں گے۔ اس طرح کچھ وقت بھی گزر جائے گا لیکن اصل بات یہ تھی کھڑکھاند گروپ کے مالی حالات ان دنوں کافی دگرگوں تھے اور گنجے والا جانتے تھے کہ کرایہ اسے ہی دینا پڑے گا، اس لیے اس نے اس تجویز کی ہی مخالفت کر دی تھی۔

کھڑکھاند گروپ اپنی مضبوط ”قوتِ ارادیٔ افطاری“ کی بدولت آدھا گھنٹا پہلے ہی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہُو کا عالم طاری ہے۔ نہ شامیانے، نہ قناتیں...... نہ بندہ، نہ بندے کی ذات!

”یااللہ خیر...... آثار کچھ اچھے دکھائی نہیں دیتے۔“ گنجے والا نے اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے پُرتشویش انداز میں کہا۔

”کک...... کہیں ہم غلط جگہ تو نہیں آ گئے؟“ ملنگی نے گھبرا کر پوچھا۔

”نہیں...... جگہ تو یہی ہے۔“ گنجے والا نے وثوق سے کہا۔ ”یہ دیکھو...... گیٹ پر نیم پلیٹ بھی لگی ہوئی ہے: ن م راشد۔ ممبر نیشنل اسمبلی، پاکستان۔“

”مبارکاں مبارکاں...... پھر تو کام بن گیا۔“ مبارکاں نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھائی، حقیقتاً نہیں بلکہ محاورتاً...... حقیقتاً وہ اُچھلنے کے قابل ہی کہاں رہے تھے۔ روزے نے انہیں ایسے نچوڑ کے رکھ دیا تھا، جیسے ایک دبلے پتلے آدمی نے لیموں کو!“

لو جناب، آپ کو یہ قصہ بھی سنا ہی دیں۔ بھرے مجمعے میں ایک پہلوان نے ایک لیموں کو چیر کر نچوڑا اور چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ ”ہے کوئی شہ زور جو اس لیموں میں سے ایک قطرہ رس بھی نچوڑ کر دکھا دے؟ میری طاقت نے اس میں کچھ نہیں چھوڑا۔“ چند ہٹے کٹے آدمی آگے بڑھے اور پوری قوت سے لیموں کو نچوڑا مگر رس کا ایک قطرہ بھی نہ نکال سکے۔ تب ایک دبلا پتلا آدمی آگے آیا اور لیموں سے ایک چھوڑ، تین قطرے نچوڑ لیے۔ پہلوان اس کی طاقت پر حیران و پریشان رہ گیا اور پوچھا۔ ”جناب، آپ کون ہیں؟“ اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں!“

ملنگی نے بے صبری سے گھنٹی کا بٹن دبایا اور پھر ہاتھ اُٹھانا بھول گیا۔ فوراً ایک پٹھان ملازم بھاگتا ہوا گیٹ سے نکلا اور ملنگی کو قاتلانہ نظروں سے گھورتے ہوئے دھاڑا۔ ”اوخو چے...... پاگل کا بچہ...... گھنٹی جلائے گی کیا؟“

ملنگی سخت گھبرا گیا اور لجاجت سے کہا۔ ”خان صاب...... بھول ہو گئی، ہم تم سے معافی مانگتے ہیں۔“

ملنگی کی تکرار بڑھتے دیکھ کر گنجے والا نے ”دخل در نامعقولات“ کرتے ہوئے کھنکار کر اسے متوجہ کرنا ضروری سمجھا۔ ”او بھائی گل خان یا جو بھی تمہارا نام ہے۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو اور جلدی سے بتاؤ کہ افطار پارٹی کدھر ہے؟ یہاں کوئی ٹینٹ وغیرہ نظر نہیں آ رہے۔“

”افطاری تو ساتھ والی مسجد میں ہے۔“ پٹھان نے جھگڑا بھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ مسجد میں افطاری؟“ چھوٹے والا نے حیران ہو کر کہا۔

”جی ہاں...... وہاں روز افطاری ہوتی ہے۔ غریب غرباء وہیں تو

روزہ افطار کرتے ہیں۔'' پٹھان چوکی دار اب مکمل موڈ میں آ گیا تھا۔

گنجے والا نے بھنا کر کہا۔ ''اے بھائی، ہم کوئی بھک منگے تھوڑے ہی ہیں...... ہمیں افطاری کی دعوت آئی ہے دعوت...... راشد صاحب کی طرف سے۔'' گنجے والا نے ساتھ ہی دعوت نامہ جیب سے نکال کر ہوا میں لہرانا ضروری سمجھا تھا۔

''ذرا کارڈ دکھاؤ ام کو۔'' پٹھان نے کارڈ گنجے والا کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ اس نے کارڈ غور سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ ''ہاہاہا...... یہ کارڈ تو کوئی ارشد صاب کا ہے۔''

''اوہ نہیں اوئے۔'' گنجے والا نے اس کے ہاتھ سے کارڈ جھپٹ لیا تھا اور پھر جب انہوں نے غور سے دیکھا تو واقعی راشد کی بجائے ارشد لکھا ہوا تھا۔ افطاری کی خوشی میں وہ ''ارشد'' کو ''راشد'' پڑھ گئے تھے۔ خیر، یہ بھی امارت میں کچھ کم نہ تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کا گھر تو دوسری کالونی میں تھا اور یہاں سے کافی فاصلہ تھا۔ پیدل جاتے تو ان کے پہنچنے تک کچھ نہ بچتا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ خوش قسمتی سے ایک طرف سے ایک چنگ چی رکشہ آتا دکھائی دیا۔ کھڑکھاند گروپ کی جان میں جان آئی۔ دادا بڈی نے سڑک کے وسط میں جا کر رُکنے کا اشارہ کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے مرنے مارنے پر تُل گیا ہو۔

رکشے والا گھبرا گیا اور اس نے ایک سائیڈ سے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن گنجے والا پھرتی سے راستہ روکتے ہوئے چلّایا۔ ''ارے بھائی، ہم کوئی ڈاکو لٹیرے نہیں...... رکشہ روکو!''

رکشے والے کی جان میں جان آئی اور اس نے رکشہ روکتے ہوئے کہا۔ ''جی دراصل مجھے افطاری کی فکر تھی، اس لیے جلدی گھر جانا چاہتا تھا۔''

''گھر بعد میں چلے جانا۔ پہلے مہربانی فرما کر ہمیں مسلم کالونی ڈراپ کر دو۔ ہم نے افطاری پر پہنچنا ہے اور وقت بہت کم ہے۔'' دادا بڈی نے بے صبری سے کہا۔

''پچاس روپے کرایہ لے لو لیکن جلدی کرو۔ کہیں رہ نہ جائیں۔'' گنجے والا نے فوراً کہا۔

''نہیں صاب...... وقت کم ہے اور میں نے اپنے گھر جا کر روزہ افطار کرنا ہے۔ آپ لوگ کوئی اور رکشہ ڈھونڈ لیں۔'' رکشے والے نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ارے سو روپے لے لو، مگر جلدی کرو۔'' مبارکاں نے کرایہ بڑھا دیا۔ گنجے والا نے اسے گھور کر دیکھا۔ رکشے والے کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے فوراً کہا۔ ''آؤ جی بیٹھو...... سو روپے کے لیے تو میں جہنم میں جانے کو بھی تیار ہوں۔''

گنجے والا اور مبارکاں آگے بیٹھ گئے اور باقی کھڑکھاندی پیچھے...... رکشے والے کو شاید کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ کیونکہ اس نے رکشہ کچھ اتنی تیزی سے چلایا کہ کھڑکھاند گروپ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ افطار پارٹی پر نہیں بلکہ سیدھا جنت میں جا رہے ہوں...... شہید ہو کر! گنجے والا نے بہتیرا کہا کہ بھائی! ذرا آہستہ چلاؤ، ہم

نے آپ کو افطاری پر پہنچانے کے سو روپے دیے ہیں، دوسرے جہان سدھارنے کے نہیں۔ مگر مجال ہے جو اس کے کان پر جوں تک رینگی ہو!

سڑک ویسے تو چھوٹے موٹے گڑھوں سے "مالا مال" تھی، لیکن اچانک سڑک کے بیچوں بیچ ایک خوفناک گڑھا آ گیا۔ رکشے والے نے بچنے کی پوری کوشش کی لیکن دایاں پہیہ سیدھا گڑھے میں جا لگا۔ ایک زوردار دھچکا لگا۔ گنجے والا مبارکاں تو بچ گئے کیونکہ انہوں نے گڑھا دیکھ کر مضبوطی سے لوہے کے راڈوں کو پکڑ لیا تھا۔ لیکن پیچھے بیٹھے ہوئے کھڑکھاندی اس اچانک اُفتاد سے نہ بچ سکے اور ہوا میں تقریباً اڑتے ہوئے سڑک پر لینڈ کر گئے۔ رکشہ ڈرائیور ان کی چیخوں پر ہی رکا تھا۔ گنجے والا اور مبارکاں بھاگ کر گئے۔ دادا بڈی کی حالت ذرا زیادہ بری تھی کیونکہ چھوٹے والا اور ملنگی اس کے اوپر گرے پڑے تھے۔

"ارے کم بختو! اب اُٹھ بھی جاؤ میرے اوپر سے..... میری تو بڑی پسلی ایک ہوگئی ہے!" دادا بڈی نیچے سے کراہا۔

"مبارکاں مبارکاں..... آپ تو لگتا ہے 'رگبی' کے کھلاڑی بن گئے ہیں!" مبارکاں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ واقعی وہ اس طرح پڑے تھے جیسے رگبی کے کھلاڑی گیند کے اوپر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو جاتے ہیں اور پھر پتا نہیں کس طرح نیچے والا کھلاڑی اچانک نیچے سے کھسک لیتا ہے اور بال لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن ظاہر ہے، دادا بڈی میں یہ مہارت مفقود تھی۔ اس لیے گنجے والا نے پہلے ملنگی اور چھوٹے والا کو گھسیٹ کر الگ پھینکا، پھر دادا بڈی کو سہارا دے کر رکشے میں بٹھایا۔ باقی لوگ بھی بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے رکشہ آگے بڑھایا لیکن گنجے والا کی خوفناک نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اب رکشا ڈرائیور نے رفتار خاصی کم ہی رکھی تھی۔

اللہ اللہ کر کے ارشد صاحب کے گھر کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی کہ شامیانے اور قناتیں لگی ہوئی تھیں اور خوب چہل پہل تھی۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے، ارشد صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور آتے ہی گنجے والا سے لپٹ گئے۔ "ارے صاحب! آپ نے بڑی دیر کر دی۔ بندۂ خدا.... ذرا جلدی آنا تھا۔ کچھ گپ شپ ہو رہتی۔ آج کل "تعلیم و تربیت" میں بڑے تذکرے پڑھے ہیں کھڑکھاند گروپ کے..... آیئے بیٹھیے!" وہ نان سٹاپ بولتے چلے گئے۔

کھڑکھاند گروپ نے چاروں طرف کا عقابی نظروں سے جائزہ لے ڈالا تھا۔ کوئی کرسی خالی نظر نہ آئی۔ سب میز پُر ہو چکے تھے بلکہ "اوورلوڈ" کہنا مناسب ہوگا۔ گنجے والا نے صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی۔ "جناب کہاں بیٹھیں..... سب میز کرسیاں تو پُر ہو چکی ہیں۔"

"ارے ہاں..... بات تو آپ نے ٹھیک کہی۔" ارشد صاحب نے پریشانی سے کہا۔ "اب دیکھیں ناں..... آپ کی طرح سارے معزز مہمان ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہیں اُٹھا دیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں، ایک چارپائی ہی ڈال دیتے ہیں۔ دیکھیے آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔"

"نہیں نہیں..... اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟" گنجے والا سے پہلے دادا بڈی نے جواب دیا۔ "لیکن جناب، جلدی کریں..... ورنہ کمزوری کی وجہ سے ہماری ٹانگیں جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکاری ہو جائیں گی۔"

ارشد صاحب نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اور تھوڑی ہی دیر میں میز لگا دی گئی۔ میز پر انواع و اقسام کے پھل اور نمکین ڈشیں سجی ہوئی تھیں۔ رائتہ، سلاد اور چٹنی کے ڈونگے بھی رکھ دیئے گئے۔ اس کے بعد چارپائی لائی گئی، جسے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ یہ دراصل چارپائی کا بچہ یعنی کھٹولا تھا، جو شاید کسی عجائب گھر سے منگوایا گیا تھا۔ کھڑکھاند گروپ اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ شاید چنگیز خان جب برصغیر آیا تھا تو اسی پر بیٹھ کر قتل کے احکام جاری کیا کرتا تھا یا یہ بھی ممکن ہے کہ پطرس بخاری مرحوم کی سائیکل کی طرح یہ کھٹولا ہل، رہٹ، چرخہ اور اسی قبیل کی تمام جدید ایجادات سے پہلے کا تھا۔ بہرحال کھڑکھاند گروپ اس کی حالتِ زار دیکھ کر اس پر تشریف فرما ہونے سے ہچکچا رہا تھا کہ اچانک قریبی مسجد سے ہُوٹر بجنے لگا۔ یہ دیکھ کر سارے کھڑکھاندی جلدی جلدی کھٹولے پر بیٹھ گئے کیوں کہ بھوک اور پیاس کے مارے سب کا بُرا حال تھا۔ گنجے والا کی تو جگہ ہی نہ بچی تھی لیکن وہ بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ جلدی سے دادا بڈی اور چھوٹے والا کے بیچ گھس کر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ کھڑکھاند گروپ لوازماتِ افطاری کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اچانک "کڑ..... کڑ..... کڑاک" کی آواز آئی اور کھٹولا ٹوٹ گیا۔ وہ بے چارہ کھڑکھاند گروپ کے وزن کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ جونہی کھٹولا ٹوٹا، کھڑکھاند گروپ عجیب بے ڈھنگے انداز میں زمین بوس

ہوگیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس اچانک افتاد سے گنجے والا کی ٹانگیں ہوا میں اُٹھ گئیں۔ سامنے پلاسٹک کے میز پر افطاری کا سامان سجا ہوا تھا۔ وہ میز بھی ایک جھٹکے سے بلند ہوئی اور کھڑکھاند گروپ پر اُلٹ گئی۔ شاید ہی کوئی بچا ہو، ورنہ رائیتا اور چٹنی اور دیگر اشیائے خورد و نوش نے انہیں افریقی جنگلیوں کا ''بھائی بھرا'' بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ افطاری میں شریک تمام مہمانوں کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ کھڑکھاند گروپ نے یہی سوچ کر صبر کے کڑوے گھونٹ پی لیے کہ ایسے نامعقول لوگ ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتے ہیں۔

اگلے روز مبارکاں ایک مقامی اخبار لے کر ''بھوت حویلی'' میں آیا اور آتے ہی چلاّ کر کہا۔ ''مبارکاں مبارکاں...... آپ کے فوٹو اخباروں میں آ گئے۔ گنجے والا تو بالکل کسی قدیم افریقی قبیلے کا سردار لگتا ہے۔'' مبارکاں کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

اخبار دیکھ کر کھڑکھاند گروپ کا مارے شرمندگی اور غصّے کے بُرا حال ہوگیا۔ اس مقامی اخبار کا کوئی رپورٹر شاید وہاں موجود تھا۔ اس نامعقول انسان نے کھڑکھاند گروپ کی عجیب و غریب نقش و نگار والی تصویریں اپنے اخبار میں دے ڈالی تھیں اور تصویریں بھی رنگین۔ فوٹو دیکھ کر پتا چلا کہ مبارکاں کا تبصرہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

گنجے والا نے اس نامعقول فوٹو گرافر کی شان میں ایک ناقابلِ اشاعت قسم کا قصیدہ کہہ ڈالا۔

دادا بڈی کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے فوراً اخبار کے دفتر کا فون ملایا اور ایڈیٹر کو بے نقط سناتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اس ننگِ انسانیت رپورٹر کا نام بتائیں ذرا...... میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ دُنیا یاد رکھے گی۔ اس دھرتی پر اس کے دن گنے جاچکے۔'' دادا بڈی کا میٹر گھوم چکا تھا۔

ایڈیٹر نے اس کی بات سن کر نہایت متانت سے کہا۔ ''جناب دادا بڈی صاحب...... آپ کی کال ریکارڈ کر لی گئی ہے۔ قانونِ فوجداری کے تحت آپ کئی دفعات کی زد میں آتے ہیں۔ آپ کے خلاف قتل کی دھمکیاں دینے اور ارادۂ قتل سمیت دہشت گردی کی ایف آئی آر بھی درج ہوسکتی ہے۔ بہتر ہے کہ ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کر لیں۔''

دادا بڈی کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''اجی، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ارے، میں اور قتل؟ توبہ کرو جی...... میں نے تو آج تک ایک مکھی بھی نہیں ماری...... اور پھر آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں...... ارے گنجے والا، تم ہی انہیں کچھ سمجھاؤ!'' یہ کہتے ہوئے دادا بڈی نے فون گنجے والا کی طرف بڑھا دیا اور کھڑکھاند گروپ اس کی حالت دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

معلومات عامہ

- ☆ محمد ابن قاسم الخوارزمی وہ مسلم سائنس دان تھا جس نے ہندسوں میں صفر کا اضافہ کیا۔
- ☆ جھاواں ایک ایسا پتھر ہے جو پانی میں نہیں ڈوبتا۔
- ☆ اوپٹوفون (Optophone) ایک ایسا آلہ ہے جس سے نابینا افراد اخبار و کتاب پڑھ سکتے ہیں۔
- ☆ شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں۔
- ☆ پھولوں کا بادشاہ گلاب کو اور ملکہ گلِ داؤدی کو کہتے ہیں۔
- ☆ انسانی جسم میں '621' پٹھے، '206' ہڈیاں اور تقریباً 25 لاکھ مسام ہوتے ہیں۔
- ☆ اگر روشنی ایک دائرے میں حرکت کرے تو ایک سیکنڈ میں زمین کے گرد ساڑھے سات چکر پورے کرے۔
- ☆ خلابازوں کا لباس شیشے کے دھاگوں اور ریشوں سے تیار کیا جاتا ہے۔
- ☆ انسانی جلد کی تین تہیں ہوتی ہیں اور انسانی جلد کا وزن پورے جسم کا 16 فیصد ہوتا ہے۔
- ☆ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔
- ☆ زرافہ منہ سے آواز نہیں نکال سکتا۔
- ☆ آبدوزیں پانی سے باہر دیکھنے کے لیے جو آلہ استعمال کرتی ہیں، اسے پیری سکوپ (Peri Scope) کہتے ہیں۔

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

- ☆ بقراط نے تقریباً دو ہزار سال پہلے اس نظریے کی تردید کر دی تھی کہ بیماری کا سبب جادو ہے۔
- ☆ سمندر کے پانی میں سب سے اہم دھات میگنیشیم پائی جاتی ہے۔
- ☆ حضرت بلھے شاہؒ، غوث اعظمؒ کی اولاد میں سے تھے۔
- ☆ برف صفر درجۂ حرارت پر پگھلنا شروع ہوجاتی ہے۔
- ☆ بجلی کا سب سے اچھا موصل چاندی ہے۔
- ☆ جالینوس نے ایک خواب دیکھنے کے بعد طب کے علم کو بطور پیشہ اختیار کیا۔
- ☆ شہداد نے دُنیا میں اپنی بنائی ہوئی جنت کا نام ''ارم'' رکھا تھا۔
- ☆ قوم بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر کا نام حضرت عیسیٰؑ ہے۔
- ☆ خون میں 76 فی صد پانی ہوتا ہے۔
- ☆ البانیہ براعظم یورپ کا غریب ترین ملک ہے۔
- ☆ سائیکلوں کا شہر چین کے شہر بیجنگ کو کہا جاتا ہے۔
- ☆ ہالینڈ دُنیا کا سب سے نیچا ملک ہے۔ (محمد حارث سعید، بورے والا)

م	ش	ء	ظ	ح	ن	ی	ف	ض	ل
ح	ف	چ	ذ	ق	ت	م	ہ	ط	ح
ڑ	ق	پ	ن	س	ح	ا	غ	ا	م
ع	ت	ی	ک	ر	ص	ل	گ	ر	ز
ث	ل	د	ح	م	د	پ	ن	ق	ہ
ص	ش	ی	ا	ء	ل	ق	ہ	خ	ب
ف	و	ن	ر	ف	ب	ا	س	ط	ی
ط	گ	ج	ش	ے	ح	ع	و	خ	گ
ا	ص	ی	ن	ا	ر	م	ع	ش	ژ
ع	س	ڑ	ض	ش	ل	ٹ	ڈ	ط	ہ

آپ نے حروف ملا کر دس بچوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

احسن، عاطف، باسط، حمزہ، شفقت، عمران، حارث، طارق، جنید، حنیف

جم لنڈن نیگرو وکیل تھا۔ عامر اور عمار کا نام سن کر اس نے ان کو اسی وقت آنے کی دعوت دی اور امجد سے رخصت ہو کر وہ جم لنڈن کے گھر روانہ ہو گئے۔ وہ شہر کا مشہور وکیل تھا اور امجد کے بیان کے مطابق وہ بھی اس کا بنگلا خریدنا چاہتا تھا۔ عامر نے اس سے امجد کے بنگلے کے بارے میں بات کی تو وہ ہنس کر بولا:

''آپ مجھ سے کیوں اس بنگلے کی بات کرنے آئے ہیں؟''

''اس لیے کہ آپ بھی تو اسے خریدنے کے خواہش مند ہیں۔'' عمار بولا۔

''میں نہیں بلکہ میری ایک مؤکل فرم وہاں اپنا ایک سینٹر کھولنے کی خواہش مند ہے۔ اس کے کہنے پر میں نے مالک مکان سے بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔ ہم خاموش ہو گئے اور بس۔'' وکیل نے کہا۔

''اور جنگل کے پچھلے حصے میں آگ لگنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ آتش زنی کی واردات تھی؟'' عمار نے پوچھا۔

''فائر بریگیڈ کے محکمے اور پولیس دونوں کا بیان ہے کہ یہ سیدھا سادہ آتش زدگی کا حادثہ ہے جو کسی راہ گیر کے جلتا ہوا سگریٹ یا ماچس پھینکنے سے یا پھر آسمانی بجلی گرنے سے ہوا۔ ایک رات پہلے گرج چمک کے ساتھ بارش بھی تو ہوئی تھی ناں۔'' وکیل نے جواب دیا۔

''کسی نے امجد کو فون پر دھمکی بھی تو دی تھی کہ بنگلا نہ بیچا تو اسے آگ لگا دی جائے گی۔'' عامر نے کہا۔

''یہ جنگل کی آگ سے پہلے کی بات ہے یا بعد کی؟'' وکیل نے پوچھا۔ ''پہلے کی بھی اور بعد کی بھی۔'' عامر نے جواب دیا۔

''کسی سرپھرے نے آگ کے واقعے سے فائدہ اٹھا کر بزدلی دھمکی دی ہوگی۔ میں انشورنس کے آتش زدگی کے مقدمات لیتا رہتا ہوں۔ ایسے واقعات میں اس قسم کی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔'' وکیل نے کہا اور پھر غور سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر بولا:

''مگر آپ اس بنگلے کے احاطے میں کیا دل چسپی رکھتے ہیں؟''

''مالک مکان کے بیٹے امجد نے تحقیقات کے لیے ہماری خدمات حاصل کی ہیں۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''امجد کا خیال ہے کہ آگ کسی نے جان بوجھ کر لگائی ہے تاکہ اس کے والد کو خوف زدہ کر کے بنگلا بیچنے پر آمادہ کیا جا سکے۔'' عمار نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ امجد کا وہم ہے لیکن اس تحقیقات کے دوران اگر آپ لوگوں کو کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں۔'' جم لنڈن نے بڑی شفقت سے کہا۔ لڑکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جم لنڈن انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا اور مسکراتے ہوئے بولا ''ممکن ہے ہم مل جل کر یہ معما حاصل کر لیں۔''

اس کے بعد دونوں لڑکے امجد کے بتائے ہوئے پتے پر اس

بلڈنگ کے سامنے پہنچے جس کے کمرہ نمبر 415 کے حوالے سے گم نام فون آیا تھا۔

عمارت کے برآمدے میں لکڑی کے بنچ پر ایک نیگرو چوکیدار بیٹھا تھا۔ عامر نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان اور انگریزی میں اپنا مطلب بیان کیا تو وہ خفگی سے بولا: ''وہ رہائشی کمرہ نہیں ہے۔ چھوٹا سا دفتر ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے، ہم اسے دیکھنا چاہیں گے۔'' عمار نے کہا۔

چوکیدار کافی پس و پیش کے بعد اُٹھا اور انہیں تیسری منزل پر لے گیا۔ وہاں اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور عامر نے کمرے میں داخل ہو کر اس کا جائزہ لیا۔ یہ واقعی ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ اس کا فرش گرد آلود تھا۔ دیواروں پر جالے لٹک رہے تھے۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ صرف ایک چھوٹی سی تپائی پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''بس ایک ٹیلی فون پڑا ہے!'' عامر نے کہا۔

''وہ بھی کٹا ہوا ہے۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ رہنے کے قابل نہیں۔'' حبشی نے خفگی کے لہجے میں کہا۔

''ہاں، آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' عامر نے نرمی سے کہا اور معذرت کر کے دونوں نیچے آ گئے۔

''بڑا غیر دوستانہ رویہ تھا اس کا۔'' عمار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کتنی عجلت سے ہمیں کمرے سے نکال کر اس نے دروازہ بند کیا۔ مجھے تو محسوس ہوتا ہے جیسے دال میں کچھ کالا ہے۔'' عامر بولا۔

عامر نے گاڑی اسٹارٹ کی تو عمار نے ڈائری نکال کر امجد کا بتایا ہوا نقشہ دیکھا۔ انہیں بیس بائیس میل جنوب کی طرف جانا تھا۔ شہر کی حدود سے نکل کر جب وہ کھلی فضا میں آئے تو قدرتی مناظر دیکھ کر جھوم اٹھے۔ چاروں طرف اونچے اونچے تناور درخت تھے اور ان کے پس منظر میں افق پر پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے اور اونچی نیچی چٹانیں۔ ان کے پیچھے گہرا نیلا آسمان اور پھر ہریالی کی میٹھی میٹھی باس میں رچی ہوئی تازہ اور فرحت بخش ہوا۔

وہ مزے مزے سے ڈرائیو کرتے اور نئے کیس پر تبادلۂ خیال کرتے چلے جا رہے تھے۔ زرعی زمینوں میں لوگ کام کر رہے تھے۔ زیادہ تر کسان جدید قسم کے زرعی آلات استعمال کر رہے تھے اور انہوں نے نئی طرز پر فارم بنا رکھے تھے۔ فارموں کے درمیان حد بندی کے لیے پتھر کی دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ دس بارہ میل پر گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہیں کہیں درمیان میں دو تین میل کا کھلا قطعہ آ جاتا، جہاں کوئی نہ کوئی فارم ہوتا۔ جب تو جا کی حدود میں داخل ہوئے تو ایک مکان کے قریب پولیس کی جیپ کھڑی نظر آئی۔ عامر نے گاڑی روک لی۔ ایک پولیس افسر ایک نیگرو سے باتیں کر رہا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' عامر نے انگریزی میں پوچھا۔

''سب خیریت ہے، بیٹا۔'' پولیس افسر نے انگریزی ہی میں جواب دیا ''ان مسٹر ولیم کی کار چوری ہو گئی تھی۔ میں انہیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ وہ یہاں سے دو میل ادھر، شمال کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہے، منگوا لیں۔''

''وہ سفید رنگ کی سیڈن تو نہیں تھی جس کا نمبر آر او بی 866 ہے؟''

''ہاں! ہاں! وہی ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' پولیس افسر تیز تیز قدم اُٹھاتا گاڑی کے قریب آ گیا۔ عامر نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ ولیم بھی حیرت سے منہ کھولے قریب چلا آیا۔

''کیا؟ کیا؟ تمہارا مطلب ہے کہ میری کار چرا کر کسی نے سیّد صاحب کے بیٹے امجد کا پیچھا کیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''جی ہاں۔'' عامر نے جواب دیا۔

''حد ہو گئی! اس کا مطلب یہ ہوا...... یعنی میں...... کہ میری گاڑی اور......'' مسٹر ولیم کو اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ان کی بات کاٹ کر پولیس افسر بولا:

''آپ گاڑی لے آئیں تو ہمیں اطلاع ضرور کر دیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ مسٹر ولیم لڑکوں کی طرف مڑا اور بولا: ''بچو، اندر آؤ۔ کچھ پانی وانی پیو۔''

''جی، ضرور۔'' عامر نے کہا اور دونوں بھائی اس کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں لکڑی کی کھردری میز کے گرد چند کرسیاں رکھی تھیں۔ مسز ولیم دو گلاسوں میں شربت بنا کر لائیں اور مہمانوں کو دیا۔

''تم لوگ اس طرف کیسے آئے؟'' وہ شربت پی چکے تو مسٹر ولیم نے پوچھا۔

''جی ہم کو ذرا گرین ولا تک جانا ہے۔'' عامر نے کہا۔

دونوں میاں بیوی نے ایک دم چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں خوف کی جھلک تھی۔

''کیوں؟ گرین ولا میں تمہارا کیا کام ہے؟'' مسز ولیم نے پوچھا۔

''اس بنگلے کے پیچھے والے جنگل میں جو آگ لگی تھی، ہمیں اس کی حقیقت معلوم کرنی ہے۔ امجد نے یہ کام ہمارے سپرد کیا ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''یہ زومبی کا کام ہے! 25 برس سے ہم لوگ اس زومبی کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے ہیں۔''

''کیا زومبی لوگوں کا وہم نہیں ہے؟'' عامر نے یہ کہا ہی تھا کہ وہ ایک دھماکے سے چونک گیا۔ مسٹر ولیم نے پورے زور سے میز پر مکا مارا تھا۔

''نہیں، میں نے آگ لگنے والے دن خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے؟'' اس نے پُرزور لہجے میں کہا۔ عامر اور عمار پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عامر نے پوچھا:

''کیا آپ ہمیں پورا واقعہ بتائیں گے؟ آپ نے اسے کیسے دیکھا؟''

''میں سید صاحب کے مکان کے پیچھے جنگل میں، خرگوشوں کا شکار کھیل رہا تھا کہ میرا گھوڑا زور زور سے ہنہنایا۔ میں نے سر اوپر اُٹھایا تو درختوں کے درمیان زومبی پر نظر پڑی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گھنی جھاڑیوں میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔'' مسٹر ولیم نے بیان کیا۔

''یہ آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جسے آپ نے دیکھا، وہ ضرور زومبی ہی تھا؟'' عمار نے سوال کیا۔

''جیمین یونی فارم زومبی کے سوا اور کون پہنے گا؟ اور وہ لاش جیسا سفید اور خوفناک چہرہ! توبہ ہے! میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔''

''نا بیٹا! ایسے کام میں ہاتھ نہ ڈالو۔ جاؤ، گھر واپس چلے جاؤ۔'' مسز ولیم نے کہا۔

''مگر اب ہم واپس نہیں جا سکتے۔ ہم امجد سے وعدہ کر چکے ہیں کہ آگ کی تحقیقات کریں گے۔'' عامر نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئے اور گرین ولا کی طرف روانہ ہوئے۔ بنگلا خاصا بڑا اور خوب صورت تھا۔ انہوں نے بنگلے کا گیٹ کھول کر کار اندر کھڑی کی اور آس پاس کا جائزہ لیا۔ مکان کے پچھواڑے جلی ہوئی جھاڑیوں اور جھلسے ہوئے درختوں سے پتا چلتا تھا کہ آگ یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اگر کچھ دیر اور اس پر قابو نہ پایا جاتا تو بنگلا اس کی لپیٹ میں آ جاتا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ عامر نے جیب میں سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور کمروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ باورچی خانے میں گئے تو ایک چولہے کو دیکھ کر عمار بولا:

''یوں لگتا ہے جیسے امجد اور اس کے دوست ٹوگو نے یہاں جلدی جلدی کچھ کھانے کو تیار کیا ہو۔ دیکھو، ہر چیز بکھری پڑی ہے۔''

''اور اس جار میں تازہ سموسے اور کریم رول پڑے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کوئی یہاں ناشتا کرتا ہے۔'' عامر نے کہا۔

''کہیں زومبی تو یہاں آ کر دعوت نہیں اُڑاتا؟'' عمار بولا۔

''ان کمروں میں تو کچھ نہیں ملا۔ چلو، اوپر چلتے ہیں۔ شاید کوئی سراغ ملے۔'' عامر نے بھائی کی بات کو اَن سنی کرتے ہوئے کہا اور وہ لکڑی کا ایک تنگ سا زینہ چڑھ کر اوپر آئے۔ زینہ ایک بہت بڑے کمرے میں ختم ہوتا تھا، جس میں بہت سے چھوٹے دریچے تھے۔

جب وہ سارا بنگلا دیکھ چکے تو عامر نے کہا: ''سارا گھر تو ہم نے دیکھ لیا، ایک تہ خانہ دیکھنا باقی ہے۔ میں نے اوپر آتے وقت باورچی خانے میں اس کا دروازہ دیکھا تھا۔ چلو، وہاں بھی دیکھ لیں۔''

دونوں نیچے واپس آئے۔ تہ خانے کا دروازہ کھولا اور نیچے اُتر گئے۔ کھلے دروازے سے سورج کی جو روشنی اندر پہنچتی تھی وہ بس آخری زینے تک محدود تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ انہوں نے آخری سیڑھی پر موم بتیوں کا پیکٹ اور ایک ماچس کی ڈبیا پڑی دیکھی۔

''شکر ہے ہمیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارنا پڑیں گی۔'' عمار نے کہا اور دو موم بتیاں اُٹھا کر جلائیں۔ ایک عامر کو دے دی۔ وہ چند قدم چلے ہوں گے کہ عمار نے فرش پر کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ اس نے جھک کر اسے اُٹھایا اور موم بتی کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ وہ سینگ کا بنا ہوا ایک بیضوی سا پیالا تھا جس کے ایک سرے پر چمڑے کی ڈوری لگی ہوئی تھی۔

''ممکن ہے اس سے سراغ لگانے میں مدد ملے۔ اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ دیکھتے ہیں کوئی اسے اُٹھانے آتا ہے یا نہیں۔'' عامر نے کہا۔ ''مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ امجد اور ٹوگو اسے یہاں چھوڑ گئے ہوں۔'' عمار نے کہا اور پیالے کو وہیں فرش پر رکھ دیا۔ چند قدم آگے جا کر عامر کو بجلی کا سوئچ بورڈ نظر آیا مگر اس کے فیوز نکالے ہوئے تھے۔ عمار دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اسے ایک جگہ دیوار کا پلستر کھرچا ہوا نظر آیا۔ اور وہیں ایک کیل سی ابھری ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کیل کو انگلی سے دبایا تو دیوار ایک دم گھوم گئی اور وہ دھکا کھا کر دیوار کے دوسری طرف جا گرا۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور گرنے سے اسے خاصی چوٹ آئی تھی۔ (باقی آئندہ)

دل کا سکون

(یاسمین فاطمہ، لاہور)

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں، سر!'' شاکر شوگر ملز کے مینیجر نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

''ہاں، آ جاؤ۔'' سیٹھ عاشر کسی گہری سوچ میں ڈوبے بے دھیانی سے بولے۔

''سر جی! احسن گروپ آف کمپنی سے ڈیل فائنل ہو گئی ہے اور انہوں نے 25 لاکھ ایڈوانس ادائیگی بھی کر دی ہے۔'' مینیجر نے تفصیل سے بتایا۔

''اوکے، وری گڈ۔'' سیٹھ عاشر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات میں بولے۔ مینیجر تمام تفصیل بتا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور سیٹھ عاشر گم صم ہو گئے۔ ☆☆☆

''پاپا! مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔'' سیٹھ عاشر کے اکلوتے لاڈلے بیٹے شاکر نے اپنی ضرورت بیان کی۔

''پاپا کی جان کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟'' سیٹھ عاشر نے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔

''یہی کوئی پچاس ہزار۔ پاپا! میرے کلاس فیلو کی سالگرہ ہے اور میں نے اسے سرپرائز پارٹی دینی ہے۔'' شاکر نے جواب دیا۔

''یہ لیں مائی ڈیئر سن! ہمیشہ خوش رہیں۔'' سیٹھ عاشر نے پچاس ہزار کا چیک کاٹ کر دیا اور شاکر کو گلے سے لگا لیا۔

''شکریہ پاپا، بہت بہت شکریہ!'' شاکر خوشی خوشی کمرے سے باہر نکل گیا۔☆☆☆

سیٹھ عاشر کئی شوگر ملز کے مالک تھے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے باوجود سیٹھ عاشر کو حقیقی خوشی حاصل نہ تھی۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ شاید وہ تمام مصروفیات میں ایک ہستی کو بھول گئے تھے جو ہر وقت سب کو یاد رکھتا ہے۔

''بیٹا! آپ آ گئے۔'' مسز عاشر، بیگم زرناب نے اپنے لختِ جگر شاکر سے پوچھا۔

''جی ماما! آپ ابھی تک سوئی نہیں؟'' شاکر نے فرماں بردار بیٹے کی طرح ماں کو جواب دینے کے ساتھ سوال بھی کر ڈالا۔

''نہیں بیٹا...... آپ بتاؤ آپ کا فنکشن کیسا رہا؟'' بیگم زرناب نے سوال کیا۔

''اچھا تھا لیکن کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔'' شاکر نے اداس سے لہجے میں کہا۔

''بیٹا! آپ سو جائیں کافی رات ہو چکی ہے۔'' بیگم زرناب نے پیار سے کہا اور شاکر کمرے کی طرف چلا گیا۔

جو کیفیت سیٹھ عاشر کی تھی وہی شاید ان کے بیٹے شاکر کی تھی جسے وہ دُنیا کی ہر نعمت دینا چاہتے تھے۔ ان کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں تھا کیوں کہ ان کے پاس دلی سکون نہیں تھا۔ سیٹھ عاشر بیداری کے عالم میں بستر پر لیٹے تھے۔ نیند ان سے کوسوں دُور تھی۔ صبح ہونے کے قریب تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری تھی۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔" سیٹھ عاشر کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔

"حی علی الصلوٰۃ ...... حی علی الفلاح۔" یہ سن کر سیٹھ عاشر کو ایسا لطف آیا جو انہیں کبھی کسی بزنس ڈیل میں نہیں آیا۔ انہیں اپنی تمام بے قراریوں، بے چینیوں کا حل مل چکا تھا۔

سیٹھ عاشر دبے پاؤں اپنے بیٹے شاکر کے کمرے کی طرف گئے۔ ''شاکر بیٹا اُٹھو! ہمیں کوئی یاد کر رہا ہے۔'' شاکر فوراً اُٹھ گیا، گویا وہ اسی انتظار میں تھا کیوں کہ بے چینی تو دونوں باپ بیٹے کو تھی۔ ''پاپا! کون بلا رہا ہے؟'' شاکر نے معصوم بچے کی طرح سوال کیا۔ ''آؤ! میں آپ کو ان سے ملواؤں۔'' سیٹھ عاشر شاکر کو لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ دونوں نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی بے خبری اور دُوری کی معافی مانگی، پھر قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے کے بعد گھر لوٹے۔ گویا ان کے دل کی دُنیا ہی بدل گئی۔ انہیں ایسا سکون ملا جو انہیں آج تک بے تحاشا

دولت سے نہیں ملتا تھا کیوں کہ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دلوں کا سکون تو اللہ کے ذکر میں ہے۔ (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

نیا آغاز

(سمیرا انور، خانیوال)

علی کب سے منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ اس کی ممی کئی بار اس کو منانے کی کوشش کر چکی تھیں لیکن بے سود۔ اصل میں صبح اسکول جاتے ہوئے وہ وعدہ لے کر گیا تھا کہ اسکول سے واپس آنے پر وہ اور علی بازار جائیں گے لیکن چونکہ آج علی کے پاپا کو دفتر سے واپس آنے میں دیر ہوگئی تھی، اس لیے وہ ابھی تک بازار نہیں جا پائے تھے۔ دراصل دو دن بعد نیا سال شروع ہونے والا تھا اور علی کو نیا سال شروع ہونے کی خوشی میں اپنے دوستوں کو پارٹی دینا تھی۔ یہ خریداری بھی اسی سلسلے میں ہونی تھی۔ اکلوتا اور لاڈلا ہونے کے باعث علی کے ممی، پاپا اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے اور اسی وجہ سے وہ کافی حد تک ضدی اور خود سر ہو چکا تھا۔ شام تک وہ یونہی منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ شام کو جب اس کے پاپا آئے اور اس کو یوں ناراض دیکھا تو بغیر آرام کیے فوراً علی کو خریداری کے لیے لے گئے۔ علی نے جی بھر کر خریداری کی۔ وہ جس چیز کو خریدنے کی فرمائش کرتا، اس کے ممی پاپا اس کو خوشی خوشی خرید کر دے دیتے۔ اس نے اپنے دوستوں اور کزنز کے لیے نئے سال کے بہت سے کارڈز بھی خریدے۔

باقی کے دو دن بھی اس نے اسی پارٹی کی تیاری میں گزارے۔ آخر کیم جنوری کی صورت میں وہ دن آ ہی گیا جس کا انتظار علی کو شدت سے تھا۔ اس نے گھر کو غباروں اور دیگر آرائشی سامان سے خوب سجایا۔ اس کے ممی، پاپا بھی اس کے ساتھ خوشی خوشی شریک تھے۔ بہت سی کھانے پینے کی اشیاء کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ علی بہت خوش تھا۔ شام ہوتے ہی مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں زیادہ تر علی کے دوست اور کلاس فیلوز تھے۔ کچھ قریبی رشتہ داروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں علی کی بڑی خالہ بھی شامل تھیں۔ وہ بہت ہی نیک خاتون تھیں۔ ان کا گھر لاہور میں تھا۔ کافی عرصے بعد ان کی ملاقات علی سے ہو رہی تھی۔ سب بچے اپنے کھیل کود میں مگن تھے اور وہ ایک جانب بیٹھی خاموشی سے بغور سب بچوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں علی کی ممی نے آکر بتایا کہ اب علی نئے سال کی خوشی میں کیک کاٹے گا۔ سب بچے خوشی خوشی علی کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ کیک کاٹا گیا اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء بھی مہمانوں کو پیش کی گئیں۔ بچے کھیل کود کے دوران ان ہی کھانے پینے میں مصروف تھے۔ یہ سب دیکھ کر علی کی خالہ اپنی جگہ سے اُٹھیں اور سب بچوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کہنے لگیں: ''آؤ بچو! ایک گیم کھیلتے ہیں۔'' گیم کا سن کر سب بچے جوش سے ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ علی کی خالہ بولیں: ''بچو! یہ ایک کوئز گیم ہے اور جو میرے سوال کا صحیح جواب دے گا اسے انعام ملے گا۔'' سب بچے اشتیاق سے سوال کا انتظار کرنے لگے۔ علی کی خالہ نے مسکراتی نگاہ سب بچوں پر ڈالی اور پھر سوال کیا۔ ''بچو! کیا آپ میں سے کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ یہ کون سا اسلامی مہینہ ہے؟'' سب بچے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ علی کی خالہ کچھ دیر جواب کی منتظر رہیں، اس سوال کا جواب بھی کوئی نہ دے پایا۔ کچھ بچوں کے والدین جو اس پارٹی میں شریک تھے، اب وہ بھی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ علی کی خالہ نے سب بچوں پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر کہنے لگیں: ''پیارے بچو! ہمارا اسلامی سال محرم کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔ جو کہ نہ صرف پہلا اسلامی مہینہ ہے بلکہ واقعہ کربلا کی وجہ سے بھی وہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ واقعہ کربلا تاریخ کا وہ المناک واقعہ ہے جس میں ہمارے پیارے نبیؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ اس جنگ میں ننھے منے بچے بھوک اور پیاس کی شدت سے شہید ہو گئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ لوگ نئے سال کی خوشیاں تو منا رہے ہیں لیکن آپ کو یہ پتا نہیں ہے کہ ہمارا پہلا اسلامی مہینہ کون سا ہے۔ علی بیٹا! آپ نے اس پارٹی کے لیے کتنا پیسہ ضائع کیا ہے۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اس سال کی شروعات کسی غریب کی مدد کر کے کرتے، کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر کے کرتے۔ آپ اپنے اردگرد دیکھیں کتنے ہی بچے ایسے ہیں جو آپ کے ہم عمر ہیں لیکن ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ ہم مسلمان ہیں، ہم سب کو سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرنا چاہیے۔ آپ سب آج وعدہ کریں کہ آج سے آپ نیا آغاز کریں گے اور اچھا مسلمان بننے کی کوشش کریں گے۔ سب بچے جو ندامت سے یہ سب سن رہے تھے، اثبات میں سر ہلانے لگے۔ اسی لمحے گلی میں کسی فقیر بچے کی صدا سنائی دی جو کھانے کو کچھ مانگ رہا تھا۔ علی فوراً اُٹھا اور کھانے پینے کا کچھ سامان اس بچے کو دینے کے لئے بڑھا۔ علی کی خالہ یہ دیکھ کر مسکرا اُٹھیں۔ اس نے

آغاز پر وہ دل سے خوش تھیں۔ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

دوستی کا معیار

(روشان ارشد، رحیم یار خان)

حامد کو دوست بنانے کا شوق تو بہت تھا لیکن وہ دوستی کی اصل روح کو سمجھ نہ پایا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کا دوست آئیڈیل ہو جو ہر وقت اس کے ہی ساتھ رہے اور تمام کام بہترین کرے۔ اب ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی تو ضرور ہوتی ہے لیکن حامد کسی کی خامی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے خود ہی دوستی میں بہت آگے نکل جاتا اور پھر خامی معلوم ہوتے ہی ٹھک سے دوستی ختم! یہی وجہ تھی کہ اس کا کوئی مخلص دوست نہ تھا۔ اب سب لڑکے حامد کو جان گئے تھے اور کوئی اس سے دوستی کرنے کی کوشش نہ کرتا تھا کیوں کہ اس کا اپنا مزاج ہی ایسا تھا۔ ایک مہینے میں اس نے چار دوست بدل لیے تھے۔

بلال کو اس نے زیادہ بولنے کی وجہ سے چھوڑا تھا جب کہ جمیل ایک دیہاتی سا لڑکا تھا جسے ماڈرن سوسائٹی کا زیادہ علم نہ تھا۔ سلیم کو اچھے کھانوں سے شغف تھا تو اشفاق ویڈیو گیمز کا دلدادہ۔ الغرض حامد ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی معلوم ہوتے ہی اسے چھوڑ دیتا تھا۔

اس کے اُستاد روزانہ یہی بات نوٹ کرتے تھے کہ حامد کے دوست بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ کچھ دن کسی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرے کے ساتھ۔ اب لڑکے اس سے کترانے لگے تھے۔ ایک دن حامد اکیلا سیڑھیوں پر بیٹھا، لڑکوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اس کے اُستاد، نذیر اقبال وہاں سے گزرے۔ انہوں نے حامد کو اُداس بیٹھے دیکھا تو اسے اپنے آفس لے گئے۔ انہوں نے یوں اکیلے اور اداس ہونے کی وجہ پوچھی۔ حامد تو جیسے کسی مہربان کا منتظر تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بولا: ''سر، مجھ سے کوئی دوستی نہیں کرتا۔ سب مجھ سے دُور دُور رہتے ہیں، حالاں کہ مجھ میں کوئی برائی بھی نہیں۔ میں تو نہایت اچھا اور آئیڈیل دوست بن سکتا ہوں۔ نہ تو میں اشفاق کی طرح زیادہ ویڈیو گیمز کھیلتا ہوں اور نہ ہی جمیل کی طرح دُنیا سے لاعلم ہوں۔'' سر نذیر کو کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ ''لیکن بیٹا! تمہاری تو بلال سے بہت اچھی دوستی تھی اور پھر تم اور سلیم بھی تو ہر وقت ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔''

''جی سر! لیکن وہ دونوں آئیڈیل نہیں تھے۔ میں نے ان سے دوستی ختم کر دی۔ اب ساری بات سر نذیر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ تب وہ بہت پیار سے حامد کے ساتھ صوفے پہ جا بیٹھے اور بولے: ''بیٹا! ہمارے دین اسلام کے مطابق ہمارے پیارے نبیؐ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور انسان خامیوں سے پاک نہیں۔ دوست بناؤ مگر اس میں عیب تلاش مت کرو۔ اب دیکھو! تم میں یہ خامی ہے کہ تم اپنے دوستوں میں عیب تلاش کرتے ہو۔

کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو، بار بار دوست بدلنا اچھی بات نہیں۔ دوست اگر غلطی مان لے تو اسے شرمندہ مت کرو بلکہ آگے بڑھ کر اسے سیدھے راستے پر چلنے میں اس کی مدد کرو۔ اتنی خامیوں کے باوجود تم یہ سوچتے ہو کہ کوئی تم سے دوستی کرے؟'' حامد شرمندگی سے کہنے لگا: ''سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس پہلو سے تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا لیکن اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اپنی غلطی تسلیم کروں گا بلکہ دوسروں سے معافی مانگ کر اور ان کی خامیوں سے سمجھوتہ کر کے انہیں بھی سدھارنے میں مدد کروں گا۔''

''شاباش بیٹا! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' سر نذیر نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

(نمرہ افضل، جھنگ صدر)

احمر کے والد ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کے بچپن کے دوست بہت اچھے تھے لیکن جب وہ بڑا ہوا تو وہ بُرے دوستوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ اس کے دوست چوریاں کرتے تھے جس کا احمر پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی اس خطرناک روش کا شکار ہو گیا۔ ایک دن ان کے پڑوسی جاوید صاحب کو اس کی اس حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے احمر کو بلایا۔ ''احمر! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم چوری کرتے ہو۔ تم اپنی اس حرکت سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمہاری امی سے تمہاری شکایت کروں گا۔'' جاوید صاحب نے سختی سے کہا لیکن احمر نے بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔ ایک دن احمر، جاوید صاحب کے گھر سے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔

امی کی ڈانٹ کے باوجود احمر چوریاں کرتا رہا۔ جب جوان ہوا تو اس نے باقاعدہ اپنا ایک گینگ بنا لیا۔ اس گینگ میں وہ تمام لڑکے شامل تھے جو چھوٹی موٹی چوریاں کرتے تھے۔ یہ گینگ ''منگو گینگ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ احمر کی والدہ بیماری کی وجہ سے اس دُنیا سے چل بسی۔ احمر نے امی کی وفات کے بعد شادی کر لی۔ اس

کی ایک اکلوتی بیٹی تھی جو اسے بہت عزیز تھی۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنے کام سے بے خبر رکھا۔ ایک دن منگو گینگ نے ایک بنک میں ڈاکہ ڈالا۔ کچھ دن بعد احمر کے گینگ نے ایک اور شخص کو لوٹ لیا۔ ''تمہارے پاس جتنے بھی پیسے ہیں، وہ مجھے دے دو۔'' احمر نے کہا اور پستول نکال لیا۔ ''مجھے جانے دو۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ دو تین دن سے فاقہ ہے۔ میری بیٹی بھوکی ہے، وہ مر جائے گی۔'' راہ گیر نے احمر کی بہت منتیں کیں لیکن احمر نے زبردستی اس سے پیسے چھین لیے۔ ایک دن اس کی بیٹی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ احمر نے بیٹی اور بیوی کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی چلا دی لیکن اسپتال بہت دُور تھا۔ احمر نے پولیس سے بچنے کے لیے اپنا گھر شہر سے دُور بنایا ہوا تھا۔ اچانک دو تین آدمی سڑک پر آ گئے۔ ان کے پاس ریوالور تھے۔ انہوں نے میاں بیوی اور بچی کو گاڑی سے اُتارا اور ان سے نقدی، موبائل فون اور گاڑی چھین لی۔ احمر نے ان کی بہت منتیں کیں کہ اس کی بیٹی کی طبیعت بہت خراب ہے لیکن وہ لوگ بھی آخر احمر کی طرح سخت دل تھے۔ احمر اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کو لے کر سڑک پر کھڑے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد کے لیے نہ آیا۔ اسی دوران بیٹی دم توڑ گئی۔ ماں غم کے مارے نڈھال ہوگئی اور وہ بھی چل بسی۔ احمر بالکل اکیلا ہو گیا۔ اسے اس آدمی کی یاد آ رہی تھی جس کی بیٹی بھوکی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہی میرے کیے کی سزا ہے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ پھر اس نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے آپ کو اور اس کے ساتھیوں نے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سب اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب

(محمد قمر الزمان صائم، خوشاب)

عدنان اور عثمان جڑواں بھائی تھے۔ گھر والے پیار سے انہیں چنو اور منو کہتے تھے۔ چنو بہت ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ ہوم ورک باقاعدگی سے کرتا، وقت پر پڑھتا، بڑوں کا احترام کرتا، والدین اور اساتذہ کا کہنا مانتا اور ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتا جب کہ منو لاپرواہ اور شریر تھا۔ وہ بڑوں کی عزت نہیں کرتا اور ہر کسی پر اپنی بات مسلط کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان کی امی منو کی اس عادت سے بہت پریشان تھیں۔ وہ ہر وقت منو کو سمجھاتی رہتیں کہ بیٹا! بڑوں کی عزت کیا کرو لیکن منو تھا کہ کسی بات پر کان نہ دھرتا اور اپنی من مانی کرتا رہتا۔

ایک دن منو نے چنو سے کہا: ''آج چھٹی ہے، چلو ساتھ والے جنگل میں سیر کو چلتے ہیں۔'' چنو جلد لوٹ آنے کی شرط پر ساتھ جانے کو تیار ہوگیا۔ راستے میں انہیں ایک بزرگ کا سامنا ہوا۔ چنو نے بزرگ کو ادب سے سلام کیا اور بہت سی دعائیں لیں، جب کہ منو بزرگ کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ چنو نے کہا: ''منو! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' بہرکیف دونوں آگے چل پڑے۔ آگے دریا آ گیا۔ وہ سوچنے لگے کہ دریا کیسے پار کریں؟ اچانک وہ بزرگ آئے اور چنو کو ایک گھوڑا دیتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! اس پر سوار ہو کر دریا پار کر لو۔'' اس بزرگ نے منو کو ایک لنگڑا گدھا دے دیا۔ چنو نے گھوڑے پر سوار ہو کر دریا پار کر لیا جب کہ منو دریا میں گر گیا اور مدد کے لئے پکارنے لگا۔ ''بچاؤ! بچاؤ!''

منو کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امی ساتھ بیٹھی ہیں۔ انہوں نے پوچھا: ''بیٹا! کیا ہوا؟ تم نیند میں بچاؤ! بچاؤ کی آوازیں لگا رہے تھے۔'' منو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ خواب تھا۔ اس نے امی سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بڑوں سے ادب و احترام سے پیش آئے گا اور ان کی عزت کرے گا کیوں کہ ادب کرنے سے ہی منزل ملتی ہے۔

بچو! اسی لیے تو کہتے ہیں۔ ''با ادب با نصیب! بے ادب بے نصیب۔''

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

آزادی

ضربِ کلیم

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

علامہ اقبالؒ

کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام نواز تھا جو شریف اور نہایت ایمان دار تھا، جب کہ دوسرے کا نام آصف تھا جو اپنی عیاری اور مکاری کی وجہ سے پورے گاؤں میں مشہور تھا۔ وہ دونوں بہت غریب تھے۔ نواز تو ہر وقت محنت مزدوری کرتا رہتا تھا لیکن آصف پرلے درجے کا کام چور اور کاہل واقع ہوا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے مل کر کھیتی باڑی کی اور دونوں میں یہ طے ہوا کہ ایک ہفتہ نواز گندم کی فصل کی نگہبانی کرے گا اور ایک ہفتہ آصف یہ کام سرانجام دے گا۔ نواز نے تو ایک ہفتہ مسلسل محنت و مشقت سے کام لیا اور جب آصف کی باری آئی تو وہ بولا: ''دوست! میں بہت بیمار ہو گیا ہوں، لہٰذا آپ اس مرتبہ میری باری پر زمین کی رکھوالی کیجیے۔ ہاں! باقی جیسے ہی میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں دوڑتا ہوا کام پر آ جاؤں گا۔'' آصف کی اس چالاکی پر نواز کو بہت دکھ ہوا لیکن ابھی وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے بادلِ نخواستہ ہامی بھر لی اور اپنے کام میں لگ گیا۔ وہ محنت کرتا گیا اور آصف ٹالتا گیا اور آخرکار گندم کی فصل پک کر تیار ہو گئی تو آصف دوڑتا ہوا آیا اور نواز سے کہا: ''میرے دوست! فصل پک گئی ہے، لہٰذا اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوپر والا حصہ میرا اور نیچے والا حصہ تیرا۔''

نواز نے چونک کر کہا: ''یہ کیسی تقسیم! پورے سال کی محنت میری اور اس کا پھل تجھے ملے۔ مجھے تیری تقسیم قبول نہیں ہے۔'' آصف نے یہ سنا تو وہ دوڑتا ہوا گاؤں کے ایک معزز بزرگ کے پاس آیا اور اسے کہا کہ آپ ہمارا فیصلہ کریں۔ ہم دونوں نے مل کر یہ فصل تیار کی ہے اور اب میرا دوست مجھے میرا حصہ نہیں دے رہا ہے۔ بزرگ نے نواز کو بلایا اور کہا: ''بیٹا! آپ تو سمجھ دار ہو، آصف کو اس کا حق کیوں نہیں دے رہے ہو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں دُور چلے جاؤ۔'' بزرگ اپنا فیصلہ سنا کر چلا گیا اور نواز کو گاؤں چھوڑنے کے خوف سے یہ فیصلہ ماننا پڑا۔

آصف کے پاس تو کافی گندم جمع ہو چکی تھی جسے وہ آہستہ آہستہ بیچتا رہا اور کافی گندم ایک گودام میں جمع کر کے رکھ دی۔ دوسری طرف نواز بے چارے کو گندم کا ایک دانا بھی نصیب نہیں ہوا، صرف اس کے حصے میں بھوسا آیا جسے وہ بیچ کر اپنا پیٹ پالتا رہا اور وعدہ کیا کہ آئندہ آصف سے مل کر کوئی بھی کام نہیں کرے گا۔ اس مرتبہ اس نے اکیلے ہی گاجر کی فصل اُگائی اور نئے سرے سے محنت و مشقت کرنے لگا۔ بچو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آصف نہایت سست اور کاہل تھا، اسی وجہ سے اس کی گودام میں پڑی ہوئی ساری گندم پڑے پڑے خراب ہو گئی۔ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے آصف نے وقت پر گندم کو بازار نہیں بیچا، اس لیے اسے آج یہ

دن دیکھنا پڑا۔ دوست بھی جاتا رہا اور گندم بھی۔ آصف بڑا مکار تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس مرتبہ پھر نواز کو اپنے جال میں پھنسایا جائے اور اس سال کے لیے بھی کچھ فصل بچائی جائے۔ سو وہ مگرمچھ کے آنسو بہاتا ہوا نواز کے پاس آیا اور کہا: ''میرے پیارے دوست! مجھے معاف کر دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مرتبہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ کو پتا ہے کہ اناج سارا خراب ہو گیا ہے اور اب میں بھوکا مر رہا ہوں۔''

چونکہ نواز ایک رحم دل نوجوان تھا اس لیے آصف کو اس نے ایک اور موقع دیا، لیکن اس بار بھی آصف اپنی پرانی عادتوں سے باز نہیں آیا اور جب فصل پک گئی تو پھر تقسیم کی بات کرتے ہوئے نواز سے جھگڑ پڑا۔ اس مرتبہ بھی وہ گاؤں کے اس بزرگ کے سامنے پیش ہوئے جس نے پچھلے سال اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ آصف بولا: ''جناب! پچھلی مرتبہ آپ کے فیصلے کے مطابق میں نے فصل کا اوپر والا حصہ اپنے پاس رکھا تھا، جب کہ اس مرتبہ میں خود ہی فصل کا نیچے والا حصہ اپنے پاس رکھنے پر آمادہ ہوں، لیکن میرا یہ ساتھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔'' بزرگ بولا: ''نواز بیٹے! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اصول کے مطابق اس مرتبہ آپ کو فصل کا اوپر والا حصہ ملنا چاہیے اور میرا بھی یہی فیصلہ ہے۔''

''لیکن جناب اس مرتبہ گاجر کی فصل ہے اور اس طرح تو میرے حصے میں صرف پتے ہی پتے آئیں گے۔'' بزرگ نے نواز کی ایک بات بھی نہ سنی اور اپنا فیصلہ سنا کر چلتا بنا۔ اس سال پھر نواز کو بہت نقصان ہوا۔ وہ گاجر کے پتے شہر میں بیچ کر آیا اور اپنے روزگار کے بارے میں سوچنے لگا۔ دوسری طرف آصف نے حسب معمول سستی کا مظاہرہ کیا اور روزانہ کہتا تھا کہ کل گاجروں کو زمین سے نکال کر شہر بیچ آؤں گا، آج آرام کرتا ہوں۔ اس طرح کافی دن گزر گئے اور ساری گاجریں زمین میں ہی خراب ہو گئیں۔ نواز نے سوچا کہ اب اس گاؤں میں رہنا محال ہو گیا ہے، سو وہ روزگار کے سلسلے میں کسی اور بادشاہی میں جانے لگا تو راستے میں اسے آصف ملا جس نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ نواز نے سوچا کہ کسی کے ساتھ اچھائی کرنا اچھی بات ہے، سو اس نے آصف کو ساتھ لیا اور روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کے پاس کچھ کھانے کا سامان اور پانی کی دو مشکیزیں بھی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک صحرا میں داخل ہو گئے جہاں انہیں پانی کی پیاس لگی تو آصف نے نواز سے کہا کہ پانی دونوں مشکیزوں سے پینے کے بجائے صرف ایک ہی مشک سے پیتے ہیں اور جب وہ ختم ہو جائے گا تو دوسری مشک کا پانی استعمال کریں گے۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ پہلے نواز کی مشک سے پانی پیا جائے گا، پھر ان دونوں نے پانی پیا اور آگے چلتے رہے۔ جب نواز کی مشک سے پانی ختم ہو گیا تب آصف نے نواز کو اپنی مشک سے پانی پلانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا: ''جاؤ میاں جاؤ...... کیسا پانی اور کیسا معاہدہ؟'' نواز کو تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس مرتبہ بھی آصف مجھے دھوکا ضرور دے گا، خیر آگے جا کر جب نواز پیاس کی شدت سے مرنے لگا تب نواز نے کہا: ''ایک شرط پر تجھے پانی مل سکتا ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ پانی کے عوض آپ کی ایک آنکھ نکال دوں گا، اگر ایک آنکھ کی قربانی دے سکتے ہو تو آپ کو پانی مل سکتا ہے۔'' نواز کو بہت صدمہ پہنچا کہ اس کا عیار دوست اس قدر ظالم ہو سکتا ہے اور یہ وہی آصف ہے جس کے ساتھ اس نے کتنی نیکیاں کی تھیں اور اس کی کتنی غلطیاں معاف کی تھیں۔ یہ سوچ کر نواز سکتے میں آ گیا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، اگر زندہ ہی نہ رہے گا تو آنکھ کس کام کی! سو اس نے آصف کی شرط مان لی۔

اب رات ہو چکی تھی اور نواز بھی اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ کر جا چکا تھا۔ نواز بے چارے کو پانی کے چند قطروں کے عوض اپنی آنکھ ضائع ہونے کا بہت غم تھا، لیکن پانی پینے سے اس کی جان بچ گئی تھی۔ نواز کو وہاں پر ایک چھوٹا سا کیکر کا درخت نظر آیا، وہ اس درخت کے پاس آیا اور سوچا کہ آج رات وہ اسی درخت کے نیچے گزارے گا اور صبح ہوتے ہی وہ اپنا سفر جاری رکھے گا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ اس درخت پر دو پرندے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور خدا کی قدرت سے نواز کو بھی ان کی باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ایک پرندہ دوسرے پرندے سے پوچھ رہا تھا: ''میرے دوست! آج آپ کہاں چلے گئے تھے جو صبح سے نظر نہیں آئے۔ کہیں شہر تو نہیں گئے تھے...... اور شہر سے کیا خبر لائے ہو؟'' دوسرا پرندہ بولا: ''نہیں یار! میں تو ادھر ہی تھا اور آج تو کوئی بھی خبر نہیں۔ ہاں! البتہ میں آپ کو اس درخت کے بارے میں ایک راز کی بات بتا سکتا ہوں۔'' دوسرے پرندے نے بڑے ہی تجسس بھرے انداز

سے کہا: ''جلدی بتاؤ'' پہلا پرندہ بولا: ''تو سنو! اس درخت کے پتے اگر کوئی اندھا شخص اپنی آنکھوں پر باندھ لے گا تو اس کی بینائی واپس آ سکتی ہے اور اس درخت کا چھلکا اُبال کر اگر کسی جذام کی بیماری والے شخص کو اس پانی سے نہلایا جائے تو اس کی بیماری جاتی رہے گی، لیکن یہ راز آپ کسی کو نہیں بتانا۔''

دونوں پرندوں کی باتیں سن کر نواز بہت خوش ہوا اور سب سے پہلے اس نے درخت کے پتے اپنی اس آنکھ پر باندھ دیئے جو کہ ضائع ہو چکی تھی۔ پتے باندھ کر وہ سو گیا۔ صبح جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کی دوسری آنکھ بھی ٹھیک ہو گئی ہے۔ اس آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا، وہ ان پرندوں کو دعائیں دینے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ پرندے ٹھیک کہہ رہے تھے، سو اس نے درخت کے کافی سارے پتے اور چھلکا جمع کیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے وہ آخرکار ایک بادشاہی میں پہنچ گیا۔ اس نے لوگوں سے سنا کہ اس ملک کے بادشاہ کو جذام کی بیماری لاحق ہے اور وہ مرنے کے قریب ہے۔ بادشاہ کسی بھی دوائی سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا اور اس نے یہ اعلان کروا رکھا تھا کہ اگر کوئی بھی مجھے ٹھیک کر دے گا تو اپنی آدھی بادشاہی اس کے حوالے کر دوں گا اور اپنی بڑی شہزادی کے ساتھ اس کی شادی بھی کر دی جائے گی، لیکن بڑے بڑے حکیم و طبیب بادشاہ کو ٹھیک کرنے میں ناکام ہو گئے۔ نواز بھی اپنی قسمت آزمانے محل کی طرف چل نکلا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ بادشاہ کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ اس کا اعلان سنتے ہی سارے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ نواز نے اپنے ساتھ لائے اس درخت کا چھلکا نکالا اور ان سے کہا کہ اسے اُبال کر اس پانی سے بادشاہ کو نہلایا جائے۔ لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق ایسا ہی کیا اور بادشاہ کو نہلا کر ایک کمرے میں آرام کرنے کے لیے پلنگ پر سلا دیا۔ نواز کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔

بادشاہ جیسے ہی صبح نیند سے اُٹھا تو اپنے آپ کو صحیح حالت میں پایا اور بیماری کا تو جیسے نام و نشان ہی نہیں تھا۔ وہ باہر آیا اور خوشی سے سب کو بلانے لگا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ تو ٹھیک ہو گئے ہیں تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا اور بڑی عزت و تعظیم سے نواز کو بادشاہ کے محل میں لے آئے جہاں پر بادشاہ نے نواز کا شان دار استقبال کیا اور اسے ٹھیک کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ نواز نے بڑے ادب سے کہا: ''جناب! آپ کو خدا نے اس بیماری سے شفا دی ہے میں نے تو بس اپنی سی کوشش کی تھی۔ پھر تو بادشاہ کی صحت یابی کی خوشی میں پورے ملک میں جشن منایا گیا اور بادشاہ نے اپنے وعدے کے مطابق آدھی بادشاہی اور اپنی شہزادی کا ہاتھ نواز کے ہاتھ میں دے دیا۔ آج نواز اپنی اچھائی اور نیکی کی وجہ سے ملک کا بادشاہ تھا جب کہ دوسری طرف آصف اسی ہی صحرا میں بھٹک بھٹک کر بھوک و پیاس سے مر گیا تھا۔ تو دیکھا بچو کہ اچھائی کا بدلہ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے اور بُرائی کا بدلہ بُرا۔

☆☆☆

"اسد!!!" ماسٹر صاحب نے گرج دار آواز میں ہمارا اسم گرامی پکارا اور ساتھ ہی ساتھ ہمارا ازلی دشمن "مولا بخش" ہوا میں لہرایا۔

"جج...... جی...... ماسٹر جی!!" ہم نے اپنی کپکپاتی آواز پر بمشکل قابو پایا اور ماسٹر جی کی میز کے پاس کھڑے ہوگئے۔

"نالائق! یہ ٹیسٹ دیکھا ہے اپنا۔"

"اس میں دیکھنے والی بات ہی کیا ہے جو دیکھوں۔"

ہم دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئے۔ ریاضی کے ٹیسٹ میں آج پھر صفر نمبر آنے پر ہماری جو درگت بنی، اس کا خدا ہی حافظ۔ توبہ، توبہ...... ظالم مولا بخش نے میرے پھول جیسے نازک ہاتھوں کو جلا کر رکھ دیا۔ جب ماسٹر جی کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو ہماری کاپی اُٹھا کر ہمارے منہ شریف پر ماری۔ "چلے جاؤ یہاں سے! لومڑ کہیں کے!" نہ جانے ماسٹر جی ہمیں لومڑ سے کیوں تشبیہ دے گئے تھے حالاں کہ ہم نے تو کبھی چالاکی نہ کی بلکہ ہم تو سیدھے سادے اور بھولے بھالے بچے تھے۔ مار کھا کر ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے ابھی اپنی سیٹ کی جانب بڑھے ہی تھے کہ دوبارہ ماسٹر جی کی چیختی چنگھاڑتی آواز نے ہمارے نازک کانوں کے پردے پھاڑنے کی کوشش کی۔

"صاحبزادے میاں! ادھر آ کر ذرا مرغا تو بنو۔" اور ہم شرمندہ شرمندہ سے دیوار کے ساتھ مرغا بن کر کھڑے ہو گئے۔ ابا جان ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہم ککڑ ہیں۔ تبھی تو ماسٹر جی روزانہ ہمیں اس کا عملی مظاہرہ بھی مرغا بنا کر کروا دیا کرتے تھے اور ہمیں اب اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم واقعی ہی اک ککڑ ہیں۔ معصوم سے...... بے قصور سے......"

"قیامت کے روز ماسٹر جی! ہم اپنا ایک ایک بدلہ گن گن کر لیں گے۔" مرغا بنتے ہی ہمارے دماغ میں یہ بات آئی اور زبان تک لانے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔ ہائے...... ہم بے چارے معصوم...... اُف ماسٹر جی ظالم...... بھئی سیدھی سی بات تھی کہ آٹھویں جماعت کا امتحان تین بار دینے کے باوجود میری حریف ریاضی نے قسم کھالی کہ میں تو پاس ہونے ہی نہ دوں گی اور ریاضی کے ماسٹر جی...... توبہ...... اتنے سخت...... انہوں نے بھی قسم کھالی کہ ہمیں ہر حال میں یہ منحوس ریاضی گویا گھول کر پلا دیں۔ اُف...... اور اس ریاضی اور ماسٹر جی کے درمیان ہم بے چارے!!

اس دفعہ تو ماسٹر جی نے بہت سختی کی۔ اسکول ٹائم کے علاوہ بھی ہم ان کے پاس ریاضی پڑھنے جاتے تھے۔ کھیل کود پر پابندی...... ٹی وی دیکھنا بند...... یاروں سے دُوری...... اُف! اتنے مظالم...... بقول ابا جان کہ "ماسٹر جی!! اگر اس دفعہ بھی یہ گدھا ریاضی نہ پاس کر سکا تو میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اس کا گلا گھونٹ ڈالیں۔ نالائق ابھی تک آٹھویں میں ہی ایڑیاں رگڑ رہا ہے...... اس کے ساتھ والے سب یار دوست میٹرک بھی کر چکے اور

اک یہ......"

اور اس دفعہ ہم نے بھی ارادہ کرلیا کہ یا تو ریاضی سے جان چھڑانی ہے یا پھر ماسٹر جی سے۔ ہم نے خوب دل لگا کر پرچوں کی تیاری شروع کر دی۔

"اگر اس دفعہ پاس ہو گئے تو پھر مڈل اسکول کو خیر باد کہہ کر علی بھائی کے ہائی اسکول چلے جائیں گے...... شکر کریں گے کہ ماسٹر جی سے جان چھوٹے گی...... ہائے علی کے تو کتنے مزے ہیں...... وہاں تو ریاضی کے ماسٹر صاحب بھی کچھ نہیں کہتے کیوں کہ وہ ابا کے دُور پرے کے رشتے دار بھی ہیں۔" اس خیال کے آتے ہی ہماری روح تک خوشی سے جھوم اُٹھتی۔

آخر کار امتحان کا دن بھی آ گیا...... اللہ کے فضل سے تمام پرچے اچھے ہوئے اور ریاضی کا پرچہ دیکھتے ہی خوشی سے ہماری باچھیں کھل اُٹھیں اور ہم کرسی پر خوشی کی وجہ سے بیٹھ ہی نہ پا رہے تھے۔ ہم نے اردگرد ایلفی کے لیے نظریں دوڑائیں تاکہ تھوڑی سی کرسی پر لگا لیں اور چپک کر بیٹھ جائیں مگر ممتحن صاحب کی خون خوار نظروں سے ڈر کر بمشکل بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ پرچے ختم ہوئے تو ہم بالکل آزاد تھے۔ گھومتے، پھرتے...... کھیلتے کودتے...... لیکن جب بھی تصور میں ماسٹر جی کا چہرہ آتا تو روح تک کانپ اُٹھتی۔ نہ جانے کیا ہو گا؟ اگر فیل ہو گئے تو پھر ماسٹر جی کے ہتھے چڑھ جائیں گے اور اس سے آگے سوچنے کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمارا حلق خشک ہو جاتا اور دل ڈوبنے لگتا۔

آج ہمارا نتیجہ تھا۔ ہمیں پاس ہونے کی پکی اُمید تھی۔ صبح سویرے اُٹھے نہا دھو کر نماز ادا کی۔ اماں سے دعا کروائی، اماں نے لسی کا گلاس اور گرما گرم پراٹھا ہمیں کھلایا اور ہم اسکول روانہ ہو گئے۔ نتائج کا اعلان شروع ہو گیا اور جب آٹھویں جماعت سے اوّل پوزیشن کے لیے ہمارا نام پکارا گیا تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ ہم خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ ہائے یہ خوشی کی زیادتی...... ماسٹر جی سے جان چھوٹنے کی آزادی...... ہمارا تو سانس ہی نکلنے لگا۔ "ارے ساتھیو! ہمیں پکڑنا۔" اپنے پاس کھڑے دو ہم جماعتوں سے کمزور سی آواز میں کہا۔

"لگتا ہے بے چارہ بیماری سے اُٹھ کر آیا ہے۔" ایک نے تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہی دونوں کے سہارے ہم اسٹیج تک گئے اور ٹرافی وصول کر کے جن کے سہارے آئے تھے، ویسے ہی واپس گئے۔ ماسٹر جی کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے...... پتا چلا کہ آج ناسازیِ طبیعت کے باعث ماسٹر جی اسکول نہیں آئے ہیں۔ اسکول سے نکلتے ہی ہمارے قدم ماسٹر جی کے گھر کی جانب اُٹھنے لگے۔ دروازے پر پہنچتے ہی ہم نے ٹرافی والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے دستک دی۔ ماسٹر جی نے ہی دروازہ کھولا۔ نہ جانے کیوں ماسٹر جی کو دیکھتے ہی ہم ہکلانے لگے۔

"دسس...... سلام...... مم ماسٹر جی...... ہم...... اوّل آئے ہیں۔"

"ارے، بڑے تیز نکلے ہو...... کس میں اوّل آئے۔ نالائقی...... ڈھٹائی...... یا بدتمیزی میں۔" ماسٹر جی نے طنزاً سوال کیا اور ہم گڑبڑا کر رہ گئے۔

"ہم...... ہم...... اپنی جماعت میں اوّل آئے ہیں، جی!" ہم نے بمشکل بات پوری کی اور ٹرافی والا ہاتھ سامنے کیا۔

"اوہ!! شاباش...... وری گڈ......" ماسٹر جی نے خوشی سے کھنکتی آواز سے کہتے ہوئے ہمیں گلے لگایا۔

"ہاں...... تو بھئی اب تو ہائی اسکول چلے جاؤ گے ناں۔"

"شکر ہے آپ سے جان تو چھوٹے گی۔" دل میں خوش گوار سا احساس پیدا ہوا۔

"اب بھی ایسی ریاضی پڑھاؤں گا کہ اوّل تو تم ہی آؤ گے۔"

"کک...... کیا مطلب؟ جی......" ہم نے پوچھا۔

"ارے مجھے تو بتانا یاد ہی نہیں رہا تمہیں کہ میرا تبادلہ بھی اب ہائی اسکول میں ہو گیا ہے اور میں وہاں بھی ریاضی پڑھاؤں گا۔"

اس سے زیادہ سننے کی ہمارے اندر تاب نہ رہی اور ہم چیخ مار کر ماسٹر جی کے قدموں میں گر کر بے ہوش ہو گئے...... ☆☆☆

زبان کا سفر

☆ جَدی: یہ لفظ 'جدی' یعنی آبائی، موروثی سے مختلف ہے۔ یعنی 'جدی' کی طرح 'جَدی' کے 'دال' پر تشدید نہیں ہے۔ 'جَدی' کا مطلب ہے بکری یا مینڈھا۔ عربی زبان کا لفظ ہے۔ آسمان کے ایک برج کو بھی 'جَدی' کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ بکرے کی شکل کی طرح نظر آتا ہے۔ لفظ 'جَدی' جب انگریزی زبان میں پہنچا تو وہاں 'کِڈی' KIDTDY یا KIDDIE بن گیا۔ پھر یہ لفظ 'کِڈ' KID بھی کہا جانے لگا۔ 'کِڈ' کو انگریزی میں بطور فعل بھی استعمال کرتے ہیں اور مراد لیتے ہیں کسی کو سادہ اور مسکین بکری کا بچہ سمجھ کر اس کو بے وقوف بنانا یا جھانسا دینا۔

☆

☆ رُود: پانی کی گزرگاہ، سمندری یا آبی راستے کو فارسی میں "رُود" کہتے ہیں، پھر اس کا استعمال "دریا" کے لیے ہونے لگا۔ یہ لفظ انگریزی میں پہنچا تو "روڈ" ROAD بن گیا، یعنی سڑک، راستہ۔ اسی سے ملتا جلتا ایک اور لفظ بنا لیا گیا رُوٹ ROUTE مراد وہی ہے: راستہ۔

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ مجھے مصوری کا شوق ہے۔ گھر میں تصویریں بناتا رہتا ہوں مگر آپ کی شرائط سخت ہیں (پرنسپل سے سائن والی شرط)۔ ہمارے پرنسپل سخت مزاج ہیں۔ میں پنجاب پبلک اسکول میں پڑھتا ہوں اور جماعت ہفتم کا طالب علم ہوں۔ میرے بڑے بھائی جنید بھی مجھے ڈانٹتے ہیں اور امی کو کہتے ہیں کہ اس کو آپ نے کس کام پر لگا دیا ہے۔ مجھے اور میری امی کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بہت سارے رسائل منگوا کر پڑھتی ہیں اور میرا تعلیم و تربیت تو مجھ سے بھی پہلے پڑھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ حنفاء آپ ایڈیٹر کو یہ بھی لکھ دیں کہ ہر ماہ پودوں اور پھولوں کی قسموں پر لکھا کریں۔ میری امی کو پودوں کا بھی شوق ہے لیکن بہت سے پودوں کے متعلق ان کو معلوم نہیں۔ تعلیم و تربیت ہی میں انہوں نے گل شمشیر کے متعلق پڑھا تو انہیں بے حد خوشی ہوئی کیوں کہ ہمارے گھر میں گلِ شمشیر کے پودے لگے ہیں مگر امی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ گلِ شمشیر ہے۔ میرا خط ضرور شائع کریں تاکہ میرا بھائی جنید مجھے نہ ڈانٹے اور پرنسپل صاحب بھی اپنے دستخط کر دیا کریں۔ (محمد حنفاء مغل، واہ کینٹ)

☆ آپ اپنی کوشش جاری رکھیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا شکریہ!

السلام علیکم! ڈیئر ایڈیٹر صاحب، کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی۔ اس مہینے کا رسالہ بہت ہی خوب صورت تھا۔ چاند کی چودہ تاریخ کی طرح چمک رہا تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ خاص طور پر ایک کے دس، نافرمانی کی سزا، دوست وہی جو......، اور زومی کا بٹن اچھی تھی۔ میرا گلگت و ہنزہ بھی اچھی تحریر تھی۔ گنجے والا بنا حکیم نے تو ہنسا ہنسا کر بُرا حال کر دیا۔ اب اجازت چاہتے ہیں کیوں کہ امی بلا رہی ہیں اور پنسل بھی ختم ہوگئی ہے۔ اُمید ہے میرا یہ خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ میری دُعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرے، آمین۔ ہاں! آئندہ ماہ میری سال گرہ ہے، کیا آپ مجھے وش نہیں کریں گے؟ میری طرف سے آپ سب کو عید مبارک۔ (محمد اشرف، راہوالی)

☆ آپ کو سال گرہ مبارک اور عید مبارک بھی ہو۔

السلام علیکم! اڈیٹر صاحب، کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی۔ میرا نام ہاجرہ ہے، میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ میں بارہ سال کی ہوں اور مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ اس دفعہ بھی رسالہ بہت عمدہ اور بہترین تھا۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ قسط وار کہانی ''زندہ لاش'' بہت مزے کی ہے۔ سند باد جہازی کے سفر بہت دل چسپ اور تجسس سے بھرپور تھے۔ کھڑ کھاند گروپ کی کہانیاں بہت سنسنی خیز ہوتی ہیں۔ محاورہ کہانی بھی ایک بہت عمدہ سلسلہ ہے۔ چچا تیز گام کے بغیر رسالے میں کمی محسوس ہوتی ہے اور یہی کمی پوری کرنے کے لیے میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی چچا تیز گام کی ایک کہانی بھیج دوں۔ میری کہانی کا عنوان ہے ''چچا تیز گام نے آم کھائے۔'' کہانی اگر قابلِ اشاعت ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔ مجھے ادیب بننے کا بہت شوق ہے۔ میں ایک دوسری کہانی ''تین چڑیلیں'' بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر قابلِ اشاعت ہو تو اسے بھی ضرور شائع کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین!)

(بی بی ہاجرہ، ہری پور)

☆ اپنی تحریروں کے لیے فون پر رابطہ کریں۔ خط لکھنے کا شکریہ!

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحبہ، کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ اس مہینے کا رسالہ بہت اچھا تھا، خاص طور پر تندرستی ہزار نعمت ہے۔ عاجز قبل، نافرمانی کی سزا اور دوست وہی جو...... تو بہت ہی سپرہٹ تھیں۔ مہربانی کر کے میرا خط ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ تعلیم و تربیت کو مزید ترقی دے۔ آمین! (محمد سعد گل سید، چارسدہ)

السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے خیریت سے ہوں گی۔ حیرت انگیز طور پر اس دفعہ شمارہ یکم جون کو ہی دستیاب ہوگیا۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب تھا۔ پھر حمد اور نعت بھی بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ ایک کے دس، ننھی منی چڑیاں، کھڑ کھاند گروپ، بلالؓ بن ریاح، سندباد جہازی کا سفر، زندہ لاش، اور دوست وہی جو......

بہت پسند آئیں۔ دوست وہی جو ... پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ پولیس کے محکمے میں بھی ادب سے وابستہ لوگ اور اتنا اچھا لکھنے والے موجود ہیں۔ خاص طور پر میں مختصر مختصر کی تعریف کرتا ہوں اور آپی! میری بیاض سے کا معیار بہتر بنائیں، پلیز! اس پر ذرا توجہ دیں۔ عظیم بلے باز، مضمون بھی بہت اچھا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ کرکٹ کے بارے میں بھی ایک سلسلہ شروع کر دیں اور ہاں، ایک کہانی بنام ''کایا پلٹ'' بھیج رہا ہوں۔ پلیز، بتا دیں کہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں؟ اچھا! اب اجازت دیں، اگر اگلے ماہ تک زندگی نے اور تعلیم و تربیت نے وفا کی تو پھر حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ اللہ حافظ! (محمد احمد، گوجرہ)

☆ کہانی کی اشاعت کے لیے آپ کو انتظار کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔

اپریل کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ اوّل نمبر پر تین شہزادے ایک شہزادی کہانی تھی۔ باقی تمام کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ تعلیم و تربیت سے ہمارا تعلق 2014ء میں بنا۔ اسی سے ہمارے اندر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہمیں رائٹر بننے کا بے حد شوق ہے۔ کیا ہم میں اس کی صلاحیت ہے؟ پلیز! ضرور بتایئے گا تا کہ ہمارا شوق پروان چڑھے، ورنہ ہمیں یہیں پر اپنے شوق کو ختم کرنا ہوگا۔ اُمید ہے کہ آپ ہماری بڑی آپی بن کر ہمیں گائیڈ ضرور کریں گی کیوں کہ ہمارا بڑا بھائی یا بہن نہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ رب العزت ہماری آپی کو ہمیشہ خوش رکھے اور انہیں دُنیا و آخرت میں کام یاب فرمائیں۔ آپ کے لیے ایک شعر عرض ہے:

جان تم پر نثار کرتی ہوں
یہ نہیں جانتی کہ دُعا کیا ہے

☆

پھل پھول کر پھلے ہمارا تعلیم و تربیت
اُبھر اُبھر کر اُبھرے ہمارا تعلیم و تربیت

(یاسمین فاطمہ فائزہ، لاہور)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ! اپنی کہانیاں بھیجیں اور رابطہ کریں۔

ایڈیٹر تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ اُمید کرتی ہوں کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیر خیریت سے ہوگی۔ جون کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ رسالہ پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ میں بچپن سے تعلیم و تربیت پڑھتی آ رہی ہوں، مگر یہ میرا پہلا خط ہے۔ اُمید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ میں ہفتم جماعت کی طالبہ ہوں۔ انکل! سوال یہ ہے کہ...... کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کیجیے۔ (تقویٰ خلیق راجہ، واہ کینٹ)

ڈیر ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! کافی عرصے سے اس دلکش رسالے کا حصہ نہ بن سکی کیوں کہ نہم جماعت کے امتحان ہو رہے تھے۔ اس مہینے کا رسالہ پڑھا، بہت اچھا لگا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ میرے امتحان کے نتیجے کے لیے دُعا کریں اور عید الفطر مبارک ہو۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کریں۔

پھول تو بہت سے ہیں لیکن گلاب جیسا کوئی نہیں
رسالے تو بہت سے ہیں مگر تعلیم و تربیت جیسا کوئی نہیں

(فضہ سکندر)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب کرے۔ آمین!

السلام علیکم! اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ہم تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس لیے خط لکھنے کی ہمت کی ہے۔ ردی کی ٹوکری میں خط کو جگہ نہیں ملے گی۔ رسالہ اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح سپرہٹ تھا۔ تمام کہانیاں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ خدا تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(اقراء عرفان، رشید عرفان، کوٹ مومن)

السلام علیکم! جون کا تعلیم و تربیت ملا۔ ٹائٹل پر ننھے منے بچے رمضان المبارک کی آمد سے دلوں کو لبھا رہے تھے۔ کہانیوں میں ایک کے دس، پروانہ، تندرستی ہزار نعمت ہے، دوست وہی جو، نافرمانی کی سزا بہت پسند آئیں۔ میرا گلگت و ہنزہ بہت دل چسپ سلسلہ ہے۔ اس طرح کے معلوماتی سلسلے تعلیم و تربیت کی شان کو بڑھاتے ہیں، انہیں بندمت کیجیے گا۔ محاورہ کہانی اور کھٹ کھاند گروپ کے ہمراہ مختصر مختصر اور ناول بھی تنہائی کے اچھے ساتھی ثابت ہوئے۔ اگر تعلیم و تربیت میں سچی کہانیوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا جائے جن پر انعام دیا جائے تو اچھا رہے گا۔ کہانی بھیجنے والا بحوالہ کہانی ارسال کرے گا۔ اس طرح سچے واقعات کا اضافہ ہوگا اور معلومات کے ساتھ تعلیم و تربیت اور بھی معلوماتی ہو جائے گا۔ (مقصود احمد منظر، لاہور)

☆ آپ کی تجاویز پر غور کریں گے۔

حسبِ معمول ہمیں آپ کے بے شمار خط موصول ہوئے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث تمام خطوط شائع کرنے سے قاصر ہیں، تاہم سب خط لکھنے والوں کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔
آپ سب قارئین کو عیدِ سعید مبارک ہو۔

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

مسز وحید اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ مسز وحید کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر اپنے گھر کے تہہ خانے میں مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ آج بھی وہ وہاں موجود تھیں۔ ان کے شوہر مسٹر وحید بھی اکثر و بیشتر انہیں کمپنی دینے کے لیے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ تہہ خانے میں صرف ایک بلب تھا۔ مسٹر وحید نے بجلی کی کمی اور لوڈشیڈنگ کے باعث کمرے سے باہر جاتے ہوئے بلب بجھا دیا۔ مسز وحید نے کتاب سے تھوڑا سا سر اُٹھا کر وقفہ دیا اور پھر مطالعے میں مصروف ہوگئیں۔ تہہ خانے میں بلب بجھانے سے مکمل اندھیرا ہوگیا۔ وہاں نہ روشن دان ہے، نہ کھڑکی ہے اور نہ ہی روشنی کا کوئی اور ذریعہ ہے۔

پیارے بچو! ذرا سوچ سمجھ کر بتائیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ مسز وحید مطالعے میں مصروف ہیں؟

جون میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے:
بیگم نثار نے آئینے میں نقاب پوش کو دیکھ لیا تھا۔

جون 2015ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- عبداللہ محبوب، ڈی جی خان
2- اشار علی خان، گوجرانوالہ
3- خدیجہ نعیم، لاہور
4- بی بی ہاجرہ، ہری پور
5- فجر نادر، سیال کوٹ

قائداعظم محمد علی جناح کا اپنی چھوٹی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے لیے یہ اعتراف ان کی عظمت کو اور نمایاں کرتا ہے کہ ''بہن میرے لیے ہمیشہ اُمید اور روشنی کی کرن رہی ہے۔''

فاطمہ جناح ہمارے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی سب سے چھوٹی بہن تھیں، مگر انہوں نے اپنے بھائی کا خیال جس طرح رکھا، وہ بڑی بہن کے فرائض کی طرح تھا۔ قائداعظم کو اپنی اس چہیتی بہن کی پیدائش کی اطلاع اس وقت ملی جب انہیں لندن گئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔

جولائی 1893ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے کراچی میں آنکھ کھولی۔ جب قائداعظم انگلستان سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آئے تو فاطمہ جناح کی عمر تین سال تھی۔ ان کے استقبال کرنے والوں میں والد اور بہن بھائی تو تھے ہی، وہیں ننھی فاطمہ بھی اپنے وکیل بھائی کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ہر بچے کی طرح قائداعظم کو بھی اپنی ماں سے بے حد پیار تھا۔ جب وہ لندن میں لنکن انز میں زیرِ تعلیم تھے تو انہیں باری باری اپنی والدہ مٹھی بائی اور اہلیہ امر بائی کے انتقال کی خبریں ملیں۔ قائداعظم نے یہ سب کچھ حوصلے سے برداشت کیا۔

قائداعظم 1896ء میں بیرسٹر بن کر لندن سے لوٹے تو انہوں نے وکالت کے لیے بمبئی شہر کا انتخاب کیا۔ انہوں نے ننھی فاطمہ کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری خود سنبھال لی۔ تعلیمی مراحل آگے بڑھتے گئے۔ فاطمہ جناح نے احمد ڈینٹل کالج، کلکتہ سے ڈینٹسٹ کا امتحان پاس کیا اور اپنا ذاتی کلینک کھول لیا۔ قائداعظم ان دنوں اپنی بیوی مریم (رتی) جناح اور اکلوتی بیٹی دینا کے ہمراہ ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے ہر دل عزیز رہ نما تھے جو آزادی کے لیے دن رات کوشاں تھے۔

1929ء میں قائداعظم کی اہلیہ مریم (رتی) جناح عین اپنی سالگرہ والے دن انتقال کر گئیں۔ قبر کو مٹی دیتے وقت قائداعظم اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے۔ دوبارہ گھر کی ویرانی اور چھوٹی بچی کی پرورش کی ذمہ داری کا احساس قائداعظم کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا، کیوں کہ بیک وقت قائداعظم کی پیشہ وارانہ اور سیاسی مصروفیات انہیں گھر سے دُور رہنے پر مجبور کرتی تھیں۔

ان لمحات میں فاطمہ جناح نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنا کلینک بند کیا اور بھائی کے گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ گھر اور دینا جناح کی پرورش میں وہ برابر مصروف رہنے لگیں۔ قائداعظم کی اکلوتی بیٹی دینا جناح

ماں کے انتقال کے بعد نانی کے پاس زیادہ رہنے لگی تھی۔ قائداعظم کی اہلیہ مریم جناح کا تعلق اسلام قبول کرنے سے قبل پارسی مذہب سے تھا۔ دینا نے نانی کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے شادی ایک پارسی نوجوان سے کی جسے قائداعظم نے سخت ناپسند فرمایا۔

ان ہی دنوں پاکستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ قائداعظم مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے کارکنوں اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ملک کے طول وعرض کا سفر کر رہے تھے۔ مسلسل محنت نے ان کی صحت پر بُرے اثرات ڈالے تھے، اس لیے فاطمہ جناح سفر میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھیں۔ بہن نے تحریکِ پاکستان کے دوران ملک کے ہر حصے کا سفر بھائی کے ہمراہ اس لیے بھی کیا کہ قائداعظم کی طبیعت خراب ہو تو وہ فوری طور پر ڈاکٹر کو بلوا کر اس کی ہدایات کے مطابق تیمار داری کا فرض ادا کر سکیں۔

قائداعظم ملک کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ انہوں نے ایک نئے ملک کی تشکیل کے لیے دن رات کام کیا۔ یہاں بھی جاں نثار بہن ان کا ہر طرح سے خیال رکھ رہی تھی۔ کام کی زیادتی نے قائداعظم کو نڈھال کر دیا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہدایات پر وہ زیارت (کوئٹہ) چلے گئے جہاں کی آب و ہوا ان کے لیے موافق تھی۔

کمزور اور نڈھال قائداعظم محمد علی جناح نے بالآخر 11 ستمبر 1948ء کو کراچی میں آخری سانس لی۔ یہ لمحات ایک بہن کے لیے کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ بھی محال ہے۔ بھائی کے انتقال کے بعد گویا ان کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ انہیں پاکستان کے لیے اب پہلے سے زیادہ کام کرنا تھا۔ وہ اپنے اس فرض سے غافل نہیں تھیں۔ جب ملک کو ضرورت پڑی تو انہوں نے 73 سال کی عمر میں بھی مسلم لیگ کے رہ نماؤں کے اصرار پر صدارتی الیکشن میں حصہ لیا اور ملک کے دور دراز علاقوں کا دورہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اب بھی حوصلہ رکھتی ہیں۔ وہ حوصلہ ہار بھی کیسے سکتی تھیں کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح جیسے آہنی عزم و ارادے کے مالک رہ نما کی بہن تھیں۔ وہ صدارتی الیکشن میں تو کامیابی حاصل نہ کر سکیں مگر عوام کی تمام تر محبتیں ان ہی کے حصے میں آئیں۔

تحریکِ پاکستان کی رہ نما نور الصباح بیگم اپنی کتاب ''تحریکِ پاکستان اور خواتین'' میں محترمہ فاطمہ جناح کے حوالے سے تحریر کرتی ہیں: ''دہلی میں مسلم لیگ کے لیے کام کرتے ہوئے مسلم لیگی خواتین کو ہر طرح سے فاطمہ جناح کی سرپرستی حاصل تھی۔ اکثر قائداعظم مصروف ہوتے اور ہم مل نہ سکتے تو فاطمہ جناح سے مل کر قائداعظم کی ہدایات حاصل کرتے اور ان سے مشورہ کر کے عمل کرتے تھے۔ دہلی کے محلوں میں ہم مسلم خواتین کے جلسے منعقد کرواتے۔ محترمہ فاطمہ جناح ہی ان جلسوں کی صدارت فرماتیں۔ ان کی تقریر اُردو میں ہوتی، بعد میں وہ خواتین سے مصافحہ کرتیں۔

وہ قائداعظم کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں اور مشکلات میں بھرپور ساتھ دیتی تھیں۔ ایک محبت کرنے والی بہن کی حیثیت سے انہوں نے قائداعظم کی ہر وقت خدمت کی اور ان کے آرام میں کوئی خلل نہ آنے دیا۔ وہ قائداعظم کے ساتھ ہر شہر اور ہر جلسے میں ہوتی تھیں، اس لیے انہیں سیاسی معلومات بے حد زیادہ تھیں۔

میرا بچہ جو اس وقت پانچ سال کا تھا، وہ بڑے بڑے جلسوں میں قومی نظمیں بہت اچھی آواز میں سنایا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے اسے قائداعظم کی کوٹھی پر بھیج دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اس بچے کو قائداعظم محمد علی جناح کی خدمت میں پیش کیا اور اس سے قومی نظمیں سنانے کی فرمائش کی۔ بچے نے کئی نظمیں سنائیں اور آخر میں یہ پڑھا۔

ملت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح
اسلامیانِ ہند کی تلوار ہے جناح

یہ سن کر قائداعظم بے حد خوش ہوئے اور محترمہ فاطمہ جناح بھی مسکرائیں۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے شب و روز پر مبنی کتاب "My Brother" بھی تحریر کی۔ جس کا اردو ترجمہ ''میرا بھائی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

9 جولائی 1967ء کو جب صبح اُنھیں ملازم اُٹھانے کے لیے کمرے میں گیا تو وہ مردہ پڑی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں اس ملازم نے قتل کر دیا ہے جسے وہ چند دن قبل ہی ملازمت سے برطرف کر چکی تھیں۔

انہیں انتہائی عزت و احترام کے ساتھ اپنے بھائی قائداعظم کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ ☆☆☆

سوئٹزرلینڈ کو دُنیا کا سب سے خوب صورت ملک مانا جاتا ہے۔ یہ ملک برف پوش پہاڑوں، نیلی جھیلوں اور خوش رو پھولوں سے اٹے ہوئے میدانوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ملک دودھ سے بنی چیزوں یعنی پنیر اور چاکلیٹس وغیرہ کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہاں کے بچے بھی بڑے مزے سے کہانیاں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ آیئے ہم بھی آپ کو اس دیس کی ایک کہانی سناتے ہیں۔

چیڑ کے درخت بہت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ چیڑ کے درختوں کے گنجان جنگلوں میں ہمیشہ اندھیرا ہی محسوس ہوتا ہے۔ اتنا اندھیرا جتنا کسی اندھیری غار میں ہوتا ہے لیکن اوٹومنی کو اس اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ پہاڑوں پر اُگے ہوئے ان جنگلوں میں بلا کسی ہچکچاہٹ اس طرح گھومتا پھرتا تھا جیسے دن کا اُجالا ہو کیوں کہ وہ ان راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس کا گھر لکڑی سے بنا ہوا تھا جو ایک چٹان کے نیچے تحفظ کی غرض سے بنایا گیا تھا اور دن میں کئی بار اٹومنی وادی میں جاتا اور پھر پہاڑ پر واقع اپنے گھر واپس آتا۔ اب وہ پہاڑ پر بنے اپنی گائیوں کے باڑے میں جا رہا تھا جہاں ایک ننھے بچھڑے نے جنم لیا تھا۔ چیڑ کے درختوں میں خاموشی اور خوشبو رچی بسی تھی۔ اٹومنی کے پیروں کی آہٹ تک سنائی نہیں دیتی تھی کیوں کہ زمینی فرش بہت نرم تھا۔ اٹومنی جنگل سے گزر کر پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اچانک اوٹومنی رُکا، اس کے کان میں کوئی آواز آ رہی تھی۔ پھر درخت پر بیٹھا کوئی اُلو ہو ہو کر کے اُڑ گیا لیکن جو آواز اس نے سنی تھی وہ کوئی اور تھی۔ اٹومنی نے دوبارہ کان لگا کر آواز کو غور سے سننے کی کوشش کی۔ اٹومنی اپنی چھڑی سے چیڑ کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آواز کی طرف چل پڑا۔ کسی کے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز آ رہی تھی: ''آہ میری ٹانگ! میرا خیال ہے میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ خیال نہیں، میری ٹانگ واقعی ٹوٹ گئی ہے۔'' ''یہ تو پہاڑوں پر رہنے والا بونا ہے۔ اسے کیا ہوا ہے؟'' اٹومنی سوچتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا لیکن وہ آواز کے نزدیک جا رہا تھا۔ یہ ایک بونے کی آواز تھی جس نے اٹومنی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے فوراً اٹومنی کو اپنی مدد کرنے کے لیے کہا۔ اٹومنی نے دوبارہ پوچھا کہ وہ کہاں ہے کیوں کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

بونے نے اسے بتایا کہ وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا اس کی ٹانگ پر گر پڑا اور اس کی ٹانگ اس کے نیچے دب گئی۔ اب وہ حرکت نہیں کر سکتا کیوں کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اٹومنی نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں لکڑی کے ٹکڑے کو محسوس کیا اور پھر اسے پکڑ کر پورے زور سے کھینچا جس سے پہاڑوں کا بونا آزاد ہو گیا۔ بونے نے کہا: ''شکریہ اٹومنی! تم بہت نیک انسان ہو لیکن ٹانگ کے ٹوٹنے سے اب میں چل نہیں سکتا۔ مجھے بہت زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے۔'' اٹومنی نے بونے کو کہا: ''کوئی بات نہیں، میں تمھیں اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیتا ہوں۔ تمھارا کون سا بہت زیادہ بوجھ ہے، لہٰذا بونے نے اس کی کمر پر چڑھتے ہی اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر لیں۔

اٹومنی نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا اور جلد ہی پہاڑ پر اس جگہ پہنچ گیا جہاں وادی میں اس کے مویشیوں کی چراگاہ تھی۔ وہاں اس نے مویشیوں کے لیے باڑہ بھی بنایا ہوا تھا۔ باڑے میں پہنچ کر اٹومنی نے بونے کی ٹانگ پر پٹی کی اور اسے مضبوطی سے باندھ دیا اور رات سونے کے لیے گھاس پھونس کا بستر بنا دیا۔ صبح جب بونے نے اٹومنی سے رخصت چاہی تو وہ تہہ دل سے ممنون تھا۔ اس نے اٹومنی سے کہا: ''تم بہت رحمدل انسان ہو۔ ایک دن تمھیں اس نیکی کا بدلہ ضرور ملے گا لیکن اٹومنی جلد ہی اس واقعہ کو یکسر بھول گیا

کیوں کہ وہ ہر وقت زراعت کے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ دراصل اس سال اس کے فکرمند رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ سارا سال بارش کے صرف چند قطرے ہی آسمان سے برسے تھے۔ وہ اس سال اتنا غلہ اکٹھا نہیں کر پایا تھا جس سے وہ اپنے مویشیوں کا پیٹ بھر سکتا اور آگے سردیوں کی آمد آمد تھی۔ ایک شام دیر گئے وہ انہیں تفکرات کا شکار تھا کہ اس نے دروازے پر دستک سنی۔ ظاہر ہے وہ پہاڑوں کا بونا تھا۔ وہاں اس وقت اٹومنی کو ملنے کون آ سکتا تھا۔ بونے نے آتے ہی اٹومنی کو شام بخیر کہا اور اس سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ''اوہ! اچھا تو ہمارا ننھا دوست آیا ہے۔ باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ۔'' اٹومنی نے اسے اندر بلاتے ہوئے کہا اور پھر اسے اپنے پاس بنے اینٹوں کے چولہے میں جلتی آگ کے قریب بٹھا لیا۔ بونے نے کہا: ''اس دفعہ خزاں کے پتے درختوں سے جلدی جھڑنا شروع ہو گئے ہیں اور دو سال سے کھل کر بارش نہیں برسی۔ مجھے معلوم ہے اٹومنی تم اسی وجہ سے رنجیدہ ہو۔'' اٹومنی نے بونے کو بتایا کہ واقعی موسم کے حساب سے یہ سال اتنا عمدہ نہیں تھا۔ مہمان نے یہ سن کر اپنی بات جاری رکھی وہ کہنے لگا: ''تم بہت نیک انسان ہو اٹومنی! تم نے ہمیشہ میری اور میرے قبیلے کی بہت مدد کی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے جب ہمیں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ اس سال کی پہلی برف پہاڑوں کی چوٹیوں پر گر کر انہیں سفید کر چکی ہے اور اگلے ایک دو دن میں تم مجبور ہو جاؤ گے کہ اپنی گائے بھینسوں کو باڑے میں اندر لا کر باندھ دو کیوں کہ سردی میں وہ باہر نہیں چر سکتیں لیکن تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں آنے والی سردیوں میں ہمارے پاس رہنے دو۔ ہم ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور اگلے موسم بہار میں تم یہیں آ جانا اور جب ہم تمہارے مویشی واپس کریں گے تو تم دیکھنا وہ کتنے موٹے تازے ہوں گے۔''

اٹومنی اس مشورے کو دل و جان سے مان گیا لیکن بونے نے اٹومنی کو آخری نصیحت کی: ''اٹومنی! میں نے تمہیں ایک بات کی تنبیہ کرنی ہے۔ جب ہم تمہارے مویشیوں کو اونچائی سے تمہارے پاس لائیں گے تو جب تک تمام مویشی چراگاہ تک نہ پہنچ جائیں انہیں آواز دے کر نہ بلانا ورنہ وہ کسی گھاٹی میں گر کر مر جائیں گے۔''

اگلے دن پہاڑوں کا بونا اپنے ساتھیوں سمیت اٹومنی کے مویشیوں کا ریوڑ اپنے آگے لگا کر روانہ ہو گیا۔ اگلے موسم بہار میں اٹومنی شدت سے اپنے مویشیوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنے باڑے کی ایک کھڑکی میں بیٹھا پگھلتی برف کے جھرنے بنتے دیکھ رہا تھا۔ اب چٹانوں پر کہیں کہیں برف کا سفید رنگ نمایاں تھا۔ پھر اس سے رہا نہیں گیا اور وہ اونچی چوٹیوں کی طرف روانہ ہو گیا جہاں پہاڑوں کے بونے کا قبیلہ رہتا تھا۔ اس نے بونے سے ملنے کی منتخب جگہ پر گھنٹوں انتظار کیا لیکن دُور دُور تک اس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں وسوسے آنے لگے کہ شاید وہ کبھی دوبارہ اپنے مویشی نہ دیکھ سکے لیکن اچانک اسے دُور سے مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی آواز آنے لگی۔ پھر ان کے کھروں کی آوازیں اور ساتھ ان کو ہانکنے والوں کی مخصوص آوازیں بھی اس کے کان سے ٹکرائیں، اس نے دُور سے اپنا ریوڑ آتا دیکھا۔ لاتعداد چلتی ہوئی مویشیوں کی ٹانگوں میں سورج کی روشنی چھن رہی تھی اور مویشیوں کے جسموں کی جلد روشنی میں ریشم کی طرح جگ مگ کر رہی تھی۔ اٹومنی کی گائے بھینسیں کیا موٹی تازی ہو رہی تھیں اور وہ اتنی خوب صورت کبھی دکھائی نہیں دی تھیں جتنی آج نظر آ رہی تھیں۔ ریوڑ کے آگے پہاڑوں کا بونا خراماں خراماں اپنی سبک رفتاری سے چلا آ رہا تھا اور اس کے منہ سے ریوڑ کو ہانکنے کی مخصوص آوازیں نکل رہی تھیں۔ ریوڑ کے پیچھے کچھ اور بونے کے قبیلے کے لوگ تھے جو نوزائیدہ اور چھوٹے بچھڑوں کو سنبھال رہے تھے۔ وہ تعداد میں اتنے تھے جن کی گنتی کرنا مشکل تھا۔ اٹومنی کو ڈر لگنے لگا کہ جس طرح اس کا ریوڑ خطرناک چٹانوں پر چل رہا ہے، کہیں وہ کسی گھاٹی میں نہ گر جائے لیکن وہ بونے کے پیچھے ہرنیوں کی طرح اُچھلتی کودتی آ رہی تھیں۔

اٹومنی اتنا خوش تھا کہ جوشِ جذبات میں بونے کی کہی ہوئی تنبیہ یکسر بھول گیا۔ اس نے اپنی سب سے محبوب گائے کو ریوڑ کے آخر میں آتے دیکھا تو اس نے اسے آواز دے کر کہا: ''شہزادی، شہزادی! شہزادی دھیان سے، احتیاط سے...... آرام سے نیچے آؤ۔''

ابھی اس نے چلاّ کر یہ الفاظ ادا ہی کیے تھے کہ شہزادی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ گہرائی میں گر گئی۔ اب اٹومنی کو خاموشی کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ دوبارہ اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا، جب تک مکمل ریوڑ حفاظت سے چراگاہ تک نہیں پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ اپنی پیاری گائے کے جانے سے بہت رنجیدہ تھا لیکن جلد ہی وہ اپنے ریوڑ کی شادابی میں کھو کر اس غم کو بھول گیا۔ لہٰذا اٹومنی نے اپنے کیے ہوئے نیک کاموں کی وجہ سے وہ سارا سال خوش حالی میں گزارا بلکہ جب تک وہ زندہ رہا اپنے ننھے دوستوں کی وجہ سے خوش حال ہی رہا۔

رانا محمد شاہد

بلیک بکس

دو سال پہلے اپریل کی 20 تاریخ کو پاکستان کی فضائی تاریخ کا دوسرا بڑا حادثہ ہوا۔ جب اسلام آباد کے قریب ایک نجی ایئر لائن کا طیارہ گر کر تباہ ہوگیا۔ حادثے کے بعد مختلف ماہرین کی مختلف قیاس آرائیاں تھیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق پائلٹ کی حد سے زیادہ خود اعتمادی حادثے کی وجہ سے بنی تو اکثر لوگ خراب موسم کو اصل وجہ ٹھہراتے رہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک پائلٹ کو موسم کی خراب صورتِ حال کے پیشِ نظر جہاز کا رُخ لاہور یا پشاور کی طرف موڑ دینا چاہیے تھا جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ جہاز کی میٹی ننس حادثے کی بنیادی وجہ بنی۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی جو جہازوں کو کنٹرول کرنے کا ایک ادارہ ہے، ان کے بقول جہاز کی حالت بالکل ٹھیک تھی، تاہم یہ سب اس وقت تک قیاس آرائیاں ہیں، جب تک کہ جہاز کا بلیک باکس اصل صورتِ حال نہیں بتاتا۔ بلیک باکس کو ڈی کوڈ کرنے کے لیے بیرون ملک بھیج دیا گیا اور اس کے ذریعے سے ملنے والی رپورٹ کی بنیاد پر ہی کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکے گی۔

یعنی اس حادثے کی وہ چیز جس پر ساری کارروائی کی بنیاد ہے، وہ ہے بلیک باکس۔ یہ بلیک باکس ہے کیا.....؟ ایوی ایشن میں اس کی اہمیت، ساخت اور تفصیلات کیا ہیں؟ آیئے اس کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

لیپ ٹاپ بنانے والی کمپنیاں اکثر یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ ان کا بنایا ہوا کمپیوٹر ہر طرح سے اپ ڈیٹ اور محفوظ ہے۔ اسے جہاں چاہیں، لے جا کر استعمال کریں۔ اسے 15 فٹ کی بلندی سے نیچے پھینکیں تو یہ ٹوٹے گا نہیں؟ اور کیا واشنگ مشین کے پانی بھرے ٹب میں گھومنے کے بعد بھی یہ درست طور پر کام کر سکے گا؟ اگر اسے صحرا کی اڑتی ریت کے ٹیلوں کے نیچے دبا دیا جائے تو کیا یہ پھر بھی کام کر سکے گا؟ جی ہاں، آپ نہیں جانتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لیپ ٹاپ کی کارکردگی اس سے بھی زیادہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس طرح کے حفاظتی اقدامات کی آخر ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں موجود ڈیٹا اس قدر قیمتی ہوتا ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ حفاظتی اقدامات کا متقاضی ہے اور پھر جب معاملہ کسی طیارے کے ”بلیک باکس“ کا ہو تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس بلیک باکس میں سفر کرنے والے سینکڑوں لوگوں کے آخری لمحات کا ڈیٹا محفوظ ہوتا ہے۔ یہ بلیک باکس ذمہ داروں کے آخری لمحات کی کارکردگی کا ثبوت ہوتا ہے اور ان کی کمی یا کوتاہی کا تعین کرتا ہے۔

جہاز میں موجود بلیک باکس ہر پرواز کا مکمل ڈیٹا اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔ اس باکس میں جہاز کی رفتار اور جہاز کے عملہ کی آوازیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاز کے تباہ

ہونے کی صورت میں ہمیشہ ماہرین کو اس کے بلیک باکس کی تلاش رہتی ہے کیوں کہ یہی بلیک باکس ان بنیادی وجوہات کا تعین کرتا ہے جو ماہرین کو اس تہہ تک لے جاتے ہیں جو حادثے کی وجہ بنتے ہیں یعنی جہاز کا حادثہ کیسے اور کن حالات میں ہوا۔

پائلٹ کاک پٹ میں کئی ایک مائیکروفون لگے ہوتے ہیں۔ یہ جہاز کے عملہ کی گفتگو سے لے کر جہاز کی اُڑان کے دوران معاون سوئچز کے آن آف فنکشن کو بھی مانیٹر کرتے ہیں۔ یہ تمام آوازیں جہاز کے بلیک باکس میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ پُرانے بلیک باکسز میں مقناطیسی ٹیپ کا استعمال کیا جاتا تھا جب کہ آج کے بلیک باکسز ڈیجیٹل میموری کے حامل ہیں اور حادثہ سے دو گھنٹے قبل کے حالات بھی ریکارڈ کر رہے ہیں۔ جہاز میں ایک اور قسم کا بلیک باکس جسے فلائٹ ڈیٹا ریکارڈ (FDR) کہتے ہیں، بھی ہوتا ہے۔ یہ دیگر نوعیت کی معلومات فراہم کرتا ہے جس سے جہاز کے حادثے کا راز معلوم کیا جاتا ہے۔

درحقیقت بلیک باکس ہارڈویئر اور سوفٹ ویئر کا ایک شاہکار ہوتا ہے۔ جسے ایک ایسے مضبوط صندوق میں بند کیا جاتا ہے کہ فضائی حادثے کی صورت میں اس کی تباہی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہوتا حالاں کہ یہ ہوائی حادثے کی صورت میں کئی میل کی اونچائی سے زمین پر گرتا ہے۔ فضائی حادثے کے بعد تباہی والے علاقے میں بلیک باکس کی تلاش کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اسی دن اور بعض اوقات دو، تین دن میں بلیک باکس مل جاتا ہے۔

بلیک باکس کا اندرونی حصہ جس کے اندر ریکارڈنگ ڈیوائس ہوتی ہے، ٹیٹانیم کا بنا ہوتا ہے۔ اس کے اوپری حصے پر ایلومینیم کی تہہ ہوتی ہے جو سلیکا سے ڈھانپی ہوتی ہے۔ ٹیٹانیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اونچے درجہ حرارت پر پگھلتا ہے۔ اسی طرح اس میں ریکارڈنگ کے آلات بھی اس قسم کی دھات کے بنے ہوتے ہیں جو 1830 سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اس بلیک باکس کو دو ہزار فارن ہائٹ یا ایک ہزار ایک سو ڈگری پر رکھیں تو اس کا ڈیٹا ضائع ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر یہ پانچ ہزار پاؤنڈ فی مربع انچ یا اتنے وزن سے 3400 گنا زائد وزن سے بھی ٹکرائے تو بھی اس میں موجود ڈیٹا قابلِ استعمال ہو سکتا ہے۔ بلیک باکس کی مضبوطی اور پائیداری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر یہ سمندر کی تہہ میں بھی گر جائے تو خراب نہیں ہو سکتا، خواہ ایک صدی ہی کیوں نہ گزر جائے۔

جہاز کے اندر بے شمار سینسرز لگے ہوتے ہیں جو اس کی رفتار، زاویہ، ہائیڈر پریشر، الیکٹرک سسٹم، ایندھن اور دیگر معاملات کی مسلسل نگرانی کرتے ہیں۔ جدید بلیک باکسز میں پیرامیٹرز سے زائد ریکارڈنگ کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

شہری ہوا بازی کی اگر ابتدائی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ شروع میں بلیک باکس صرف سیاہ رنگ کا تھا، مگر اب اس کا رنگ نارنجی ہوتا ہے۔ یہی رنگ تفتیش کاروں کو بلیک باکس تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یہ بلیک باکس سمندر کے اوپر حادثہ ہونے کی صورت میں زیرِ آب ایک ماہ تک ہر سیکنڈ کے بعد سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ حادثہ کے بعد بلیک باکس مل جاتا تو اسے ڈی کوڈ کروایا جاتا ہے۔ لیبارٹری میں لے جا کر اس میں موجود ڈیٹا کو ڈاؤن لوڈ کیا جاتا ہے۔ پھر حادثہ جیسا ماحول پیدا کر کے سنا جاتا ہے۔

بلیک باکس کا ڈیٹا عموماً ائرلائن، جہاز ساز ادارے اور تحفظ عامہ کی متعلقہ ایجنسیاں حاصل کرتی ہیں اور ڈیٹا کی ڈی کوڈنگ کے لیے عام طور پر زبان کے ماہر کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

بلیک باکس کی تاریخ یہ ہے کہ اسے پہلی بار آسٹریلیا کی ایروناٹیکل ریسرچ لیبارٹری میں 1954ء میں تیار کیا گیا۔ اس کے موجد کا نام ڈاکٹر وارن تھا جو جہاز کے ایندھن کا اسپیشلسٹ تھا۔ اسی سال جہازوں کے ہونے والے حادثات کے حوالے سے ایک خصوصی رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ڈاکٹر وارن کی ایجاد کو سامنے رکھ کر ایک پروٹو ٹائپ ایف ڈی آر یا اے آر ایل فلائٹ میموری پرنٹ تیار کر لیا گیا تھا، مگر اس وقت تک دُنیا بھر میں شہری ہوابازی کے ادارے اس ایجاد کی اہمیت سے بے نیاز تھے، لیکن پھر 1958ء میں برطانیہ نے اس میں دلچسپی ظاہر کی اور ڈاکٹر وارن کو اس کا ماڈل بنانے کے لیے کہا گیا جس کا نام "Red Egg" رکھا گیا۔ یہ نام اس کی ساخت کی وجہ سے رکھا گیا تھا، جسے بعد میں ایک صحافی کے منہ سے بے ساختہ طور پر نکلنے والے نام بلیک باکس (Black Box) سے منسوب کر دیا گیا۔ چونکہ ابتدائی طور پر اس میں دلچسپی برطانیہ نے ہی لی تھی، اس لیے سب سے پہلے اس کا استعمال برطانوی طیاروں میں ہی ہوا۔ ☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / جولائی 2015ء ہے۔

جون 2015ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- او شیر کی خالہ...... اب اپنی خیر منا! (زائش خورشید، ایبٹ آباد)
- سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے (علینا اختر، کراچی)
- بی مانو! جو کچھ جیب میں ہے نکالو (محمد محتشم چوہان، راولپنڈی کینٹ)
- اب تخت اچھالے جائیں گے اب تاج گرائے جائیں گے (شازیہ حبیب، لاہور)
- ہم کو کھانے کا ذرا بھی نہ لانا دل میں خیال
ورنہ اسی چاقو سے اتار دیں گے تیری کھال (محمد حمزہ سعید، بورے والا)

عمیر احمد، گجرات (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

کشف طاہر، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

محمد زبیر جمشید علی، خانیوال (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عائشہ ظفر، رحیم یار خان (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

محمد عبداللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: جویریہ ادریس، سیال کوٹ۔ جویریہ یونس، لاہور۔ عائشہ صدیقہ، لاہور۔ ماریہ ادریس، سیال کوٹ۔ ویلجا فاطمہ، راجہ جنگ۔ فائزہ رزاق، خانیوال۔ ایمان انجم، ملک پور۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ عمیر رشید، راول پنڈی۔ عائشہ افضل، لاہور۔ ازکی آصف، پشاور۔ نادیہ بشیر، سیال کوٹ۔ آمنہ اقبال، گوجرانوالہ۔ ماہ نور خان، اسلام آباد۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ یسرہ سحر، کراچی۔ فضہ سکندر، سرگودھا۔ عاتکہ سہیل، لاہور۔ عزیر گل، آرون گل، جبل الیاس، نوید حمید، سیال کوٹ۔ ایقہ فاطمہ، کراچی۔ ملائکہ رؤف، لاہور۔ عدنان ملک، راول پنڈی۔ طاہر بشیر، حیدر آباد۔ زینب اظہر، ملتان۔ عطیہ خورشید، جہلم۔ آصف اقبال، سیال کوٹ۔ وقاص صادق، اسلام آباد۔ ملائکہ اشفاق، شیخوپورہ۔ فوزیہ یونس، وزیر آباد۔ محمد رزاق، گوجر خان۔ عائزہ بشارت، ہادیہ بشارت، میرپور آزاد کشمیر۔ شعیب اختر، کراچی۔ فاطمہ صادق، راول پنڈی۔ آصفہ سہیل، ایبٹ آباد۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 جولائی

آخری تاریخ 8 اگست